قیمت: -/10روپے

ماہنامہ

اگست 2005

نئی دہلی

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ڈاکٹر رفیق زکریا

ولادت: 5/اپریل 1920 وفات: 9/جولائی 2005

قومی اردو کونسل کا سالانہ اجلاسِ عام اور مجلسِ عاملہ کی میٹنگ 7/جولائی 2005 کو وزارتِ ترقی انسانی وسائل کے کمیٹی روم نمبر 112، بی ونگ، فرسٹ فلور، شاستری بھون میں منعقد ہوئی جس کی صدارت مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل اور قومی اردو کونسل کے چیئرمین جناب ارجن سنگھ نے کی۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں جناب ارجن سنگھ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کو دیکھا جا سکتا ہے۔

19/جون 2005 کو ایک تقریب میں پنجاب کیسری گروپ کی طرف سے شہید پریوار فنڈ کے تحت دہشت گردی کا شکار ہونے والے ڈیڑھ سو متاثر خاندانوں کے درمیان 2250000 روپے تقسیم کیے گئے۔ اس فنڈ کے تحت اب تک 92588800 روپے جمع کیے گئے ہیں جن میں سے 78161122 روپے 6935 خاندانوں میں تقسیم کیے جا چکے ہیں۔
تصویر میں (بائیں سے) جناب پرتھوی راج چوہان وزیر مملکت (دفتر وزیر اعظم)، جناب سرجیت سنگھ برنالا گورنر تمل ناڈو اور جناب وجے کمار چوپڑا چیف منیجنگ ڈائرکٹر اور ایڈیٹر پنجاب کیسری گروپ ایک شخص کو پندرہ ہزار روپے کا یونی آئی بونڈ اور روز مرّہ استعمال کی کچھ چیزیں دیتے ہوئے۔

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔7، شمارہ۔8 اگست 2005

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی واعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر، قومی اردو کونسل

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی - 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر.کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 8-1، تھر گلی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... خطوط 2
ہماری بات .... اداریہ 5
● بدلتا سماج اور اردو میڈیا کے لیے نئے مبارزات (گیسٹ کالم) .... اے.ایم. پٹھان 6
● اردو اور ذرائع ابلاغ کا بدلتا منظر نامہ .... زبیر رضوی 8
● اداریہ نویسی .... سہیل انجم 13
● آموزش بذریعہ امداد باہمی .... اعجاز مسیح 16
● مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی لسانی پالیسیاں اور اردو .... مشتاق احمد 19
● ادب اطفال اور ہماری بے حسی .... فیروز بخت احمد 22
● جدہ میں اردو شعر و ادب کی محفلیں .... سلیمان اطہر جاوید 23
● سائنس، ٹیکنالوجی اور سماج .... ایم.اے. قریشی 25
● علم کیمیا اور جابر بن حیان .... افضل ضیا شہزادہ 31
● پانی کا تحفظ — وقت کی اہم ضرورت .... جمال نصرت 34
● گرم ہوتی دنیا .... مہندر پانڈے 36
● یرقان (پیلیا) .... حکیم اشہر قدیر 38

اتہاس کے جھروکے سے:
● ہندوستان میں انگریزوں کی آمد .... مدن گوپال 40

گوشۂ ادب:
● فہیم حنفی سے گفتگو .... اظہار احمد ندیم 43
● یہ گھر (نظم) .... منیب الرحمان 47

گوشۂ فروغ کتب
● منتر ("کلیات پریم چند" جلد 12 سے اقتباس) .... پریم چند 48
● انیس باشندۂ لکھنؤ ("انیس" سے اقتباس) .... نیر مسعود 54

طلبہ کے لیے
● ایروناٹیکل انجینئرنگ کی تعلیم .... ایم.نسیم اعظمی 60
● آنگکس کا اضافہ .... بسنت جین 62
● اردو ادب کوئز .... محمد فیروز 64
● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-25) .... طارق کمال خاں 67

اردو خبر نامہ .... ادارہ 68

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 73
● کاشف الحقائق / سید امداد امام اثر .... مبصر: مخمور سعیدی
● اڑیسہ میں اردو / حفیظ اللہ نیولپوری .... مبصر: فیاض عالم
● دھونی کتاب — پرواز / ڈاکٹر اے.پی.جے. عبدالکلام .... مبصر: رئیس احمد
● لوک کہانیاں بھارت سے / اے.کے. رامانجن .... مبصر: اظہار احمد ندیم
● دکھنی کلام اور اسلامی تہذیبی تاریخ / خواجہ معین الدین عزمی .... مبصر: عطاء الرحمٰن قاسمی

بچوں کا گوشہ
● سالم علی ("ہندوستان کے سائنس داں" سے اقتباس) .... دلیپ ایم. سالوی 78

آپ کی بات

■ **رام پرکاش کپور، ایل سی جی-04، پی ایچ اے، لیبرنم بیکٹر-28، گڑگاؤں-122002، ہریانہ**

جون کے شمارے میں جناب ہاشم قدوائی نے اپریل کے "اردو دنیا" میں شائع شدہ "اے کے منگل سے گفتگو" کے حوالے سے لکھا ہے:

"......یہ بھی خلاف واقعہ ہے کہ سارا سرحدی صوبہ یعنی شمال مغربی سرحدی صوبہ اس پارٹی (خاکسار پارٹی) کے زیرِ اثر تھا۔ یہ صوبہ آخر تک مشہور قومی رہنما خان عبدالغفار خاں کے اثر میں رہا۔ 1946 کے تاریخی صوبہ جاتی اسمبلیوں کے انتخاب میں مسلم لیگ کو اس صوبے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور خان عبدالغفار خاں کی وجہ سے کانگریس کو اس صوبے میں کامیابی حاصل ہوئی......" اس سلسلے میں "اردو دنیا" کے قارئین کی دلچسپی کے لیے میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔

1946 کے صوبۂ سرحد کے انتخاب میں کانگریس اور خان عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر خاں صاحب کی پارٹی "خدائی خدمتگار" نے مشترکہ طور پر حصہ لیا تھا اور اسمبلی کی پچاس مسلم نشستوں میں سے اڑتیس پر کانگریس والے اتحاد کو کامیابی ملی تھی۔ مسلم لیگ کو بارہ میں سے گیارہ نشستیں غیر پشتو حلقوں سے ملی تھیں۔ پشتو بولنے والے علاقوں میں سے مسلم لیگ کو صرف ایک نشست پر کامیابی ملی تھی۔ "ہوتی مردان" کے نواب کو اپنے ذاتی اثر ورسوخ کی وجہ سے جیت حاصل ہوئی تھی، مسلم لیگ کی وجہ سے نہیں۔ انتخاب کے بعد ہوتی مردان کے نواب صاحب نے بھی مسلم لیگ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ خان عبدالغفار خاں اتنے ہردلعزیز تھے کہ ان کو پٹھان "بادشاہ خان" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

خان عبدالغفار خاں نے پٹھانوں جیسی جنگجو، غصہ ور اور جذباتی قوم کو "عدم تشدد" کا سبق پڑھایا تھا۔ 1942 میں خدائی خدمت گاروں کے جلوس پر انگریزی حکومت نے لاٹھی چارج کیا تو اس لاٹھی چارج میں خان عبدالغفار خاں زخمی ہو گئے تھے۔ کچھ نوجوان اس پر بپھر گئے تھے اور پولیس پر جوابی حملہ کرنے والے تھے۔ لیکن اسی وقت خان عبدالغفار خاں نے ان کو اپنا "عدم تشدد" پر عمل کرنے کا وعدہ یاد دلا کر انھیں خاموش کر دیا تھا۔

1945 کی شملہ کانفرنس میں جب محمد علی جناح نے یہ اصرار کیا تھا کہ وہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے واحد نمائندے ہیں تو ڈاکٹر خاں صاحب نے غصے میں ان سے پوچھا تھا کہ "پھر میں کون ہوں؟" وہ صوبۂ سرحد کے پٹھانوں کے نمائندے کے طور پر شملہ کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔

خان برادران کی ہردلعزیزی اور اصولی سیاست کی متعدد مثالیں لوک کتھاؤں کی طرح صوبۂ سرحد میں مشہور تھیں۔ اس موقعے پر میں ایک واقعہ لکھنا چاہتا ہوں۔ 1947 میں ہم لوگ کنگس وے ریلیف کیمپ دہلی میں پناہ گزیں تھے۔ کانگریس کے کچھ رضاکار وہاں سماجی خدمت کے لیے آتے تھے۔ ایک رضاکار نے ہمارے ایک بزرگ رشتے دار سے پوچھا۔ "ڈاکٹر خاں صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔" اس نے برجستہ جواب دیا "To me a man next to God is the Dr. Khan sahib." (میرے لیے خدا کے بعد ڈاکٹر خاں صاحب ہیں۔) اس وقت کے ہنگامی حالات میں ایک گھر سے بے گھر ہوئے مہاجر کا یہ جواب معنی رکھتا ہے۔

■ **انوار رضوی، 28 سی/اے-10، کالکاجی ایکسٹینشن، نئی دہلی-110019**

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا کونسل سے وابستہ ہونا یقیناً نیک فال ہے۔ "اردو دنیا" کا مطالعہ پابندی سے کرتا ہوں اور اس کے وسیلے سے اردو کی دنیا سے باخبری بھی رہتی ہے۔ خبروں کے ساتھ ہی ساتھ آپ پڑھنے کے لیے جو منتخب مواد دیتے ہیں وہ بھی خوب ہے۔

جون کے شمارے میں مخمور سعیدی کا مضمون "ذکر ایک ہمدم دیرینہ کا" بہت پسند آیا۔ مخمور سعیدی کی نثر ان کی نظم سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس مضمون میں راہی شہابی کی شخصیت کے ساتھ ان کے فن کا محاکمہ اور بیان بڑے دلنواز انداز میں ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں مخمور صاحب سے ہر ماہ اگر ایک ایسا ہی تنقیدی اور تعارفی مضمون آپ لکھوائیں تو "اردو دنیا" کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگا۔

■ **محمد جہانگیر ملک، کریسنٹ پبلک اسکول، سرسید نگر، کشن گنج، بہار**

میں 2001 سے "اردو دنیا" کا مستقل قاری ہوں۔ اب تو اس کے مطالعے کا یہ شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اسی بنیاد پر پچپن سال کی عمر میں میں نے اس سال مولانا ابوالکلام آزاد اردو یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ اردو میں داخلہ لے لیا ہے۔ جریدے میں چھپنے والے سبھی مضامین کو میں بڑے انہماک سے پڑھتا ہوں اور ان سے میں استفادہ کرتا ہوں۔

■ **محمد رفیق رانچوی، محمدی سوار العلوم، اے بی روڈ، ہیندھوا، بڑوانی، مدھیہ پردیش**

"اردو دنیا" کے بغیر ہماری دنیا بے رونق اور بے کیف محسوس ہوتی ہے۔

اس کے مضامین بڑے عمدہ، دل و دماغ کے لیے فرحت بخش اور حقیقت حال کو واشگاف کرنے والے ہوتے ہیں۔

■ **رضوان خاں، 96۔ شیخ سرائے، سیتاپور۔261001**

مئی کے ''اردو دنیا'' میں دہلی اردو کتاب میلے پر منظور عثمانی کا رپورتاژ بہت پسند آیا۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ اردو کتابوں کی اشاعت سے کہیں زیادہ اردو کے قارئین کی تعداد میں اضافے کی ضرورت ہے۔ کتب و رسائل کی تعداد تو اچھی خاصی ہے لیکن اس تناسب سے قارئین نظر نہیں آرہے ہیں۔ آج لوگ غیر ضروری چیزوں پر کافی رقم خرچ کر دیتے ہیں لیکن اپنی مادری زبان پر کچھ خرچ کرنے کا جذبہ ان میں نہیں ہے۔ اگر ہر شہر اور قصبے کی مقامی ادبی تنظیمیں عوامی بیداری کی تحریک چلائیں اور لوگوں کو اردو زبان سے دلی محبت رکھنے اور اردو کتب و رسائل نیز اردو اخبارات پر اپنی آمدنی کے حساب سے کچھ روپے خرچ کرنے کے لیے تیار کریں تو اس کے مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔ اردو خبرنامہ اور ہندوستان کے آئین سے متعلق کوئز بھی پسند آئی۔

جولائی کے شمارے کے متعدد مضامین پسند آئے، مثلاً کے پی شمس الدین کا مضمون ''کیرالا اور اردو''، عارف اقبال کا مضمون ''اردو کی بقا کے لیے چند عملی تجاویز'' اور جناب سید حامد کا مضمون ''وزیر اعظم کی اعلیٰ سطحی کمیٹی''۔ ان کے علاوہ اردو خبرنامے کی خبریں بڑی اہم ہیں۔ دراصل اردو خبرنامہ ''اردو دنیا'' کا ایک نہایت اہم اور دلچسپ مستقل کالم ہے جس کے ذریعے ہمیں تمام اردو دنیا کی اہم اور حوصلہ افزا خبروں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اردو سے متعلق تمام سرگرمیوں کی جانکاری قارئین ''اردو دنیا'' کو گھر بیٹھے ہوجاتی ہے۔ اس کے لیے آپ اور ادارہ لائق مبارکباد ہیں۔

■ **منصور خوشتر، سکریٹری ادبی چوپال، پرانی منصفی، دربھنگہ، بہار**

''اردو دنیا'' جون کے شمارے میں جناب مظہر امام سے مکتی ورما کی گفتگو پڑھی جس سے رسالے سے میری دلچسپی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ جناب عبدالمنان طرزی، پروفیسر شاکر خلیق، جناب جابر حسین، جناب سید شاہ نورالحق قادری، جناب ممتاز راشد کے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مستقل مدعوئین مقرر ہونے پر میری طرف سے اردو والوں کو دلی مبارکباد۔

■ **نوراللہ خاں، اے۔71، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی**

جون کے شمارے میں سرورق پر چھپی تصویر اور خبرنامے میں صدر جمہوریہ ہند عالی وقار ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی خودنوشت سوانح ''ونگس آف فائر'' کے اردو ترجمے ''پرواز'' سے متعلق خبر پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ اردو کی بین الاقوامیت اور اس کی شہرت کی دلیل یہی ہے کہ اس کے پاسبانوں میں ہر فرقے کے لوگ شامل ہیں۔ آج اس زبان میں مختلف مذاہب کی مقدس کتابیں اور مختلف علوم کی لاتعداد کتابیں دستیاب ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی صاحب کی نگرانی میں کونسل اور ''اردو دنیا'' کو ایک انفرادی مقام حاصل ہوسکتا ہے۔

■ **شاغل ادیب، زیب منزل، 1-4-304/9/3، صدیق نگر، مشیر آباد، حیدرآباد۔500048**

''اردو دنیا'' ہر ماہ پابندی سے مل رہا ہے۔ جون کے شمارے میں ابوذر ہاشم، مدن لال کپور، بیگم دختر جہاں، مدن گوپال کے مضامین پسند آئے۔ مگر اس بار ''گوشۂ ادب'' بہت وقیع ہے۔ اس میں جہاں بقید حیات اہل قلم کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے وہیں مرحوم قلمکاروں کو بھی خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ جناب مظہر امام سے مکتی ورما کا انٹرویو اچھا ہے۔ جناب مخمور سعیدی نے مرحوم راہی شہابی کی شخصیت و فن پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ابرار رحمانی کا مضمون ''قاضی سلیم۔ ضمیر کی آواز کا شاعر'' بھی محنت سے لکھا گیا ہے۔ جناب مصطفی علی اکبر نے اپنی مرحوم شریک حیات محترمہ آمنہ ابوالحسن کی یادوں کی خوشبو سے قارئین ''اردو دنیا'' کے ذہنوں کو خوب معطر کیا ہے۔ اس بار ''بچوں کا گوشہ'' میں بی آر امبیڈکر سے متعلق مضمون بھی خوب ہے جو قومی اردو کونسل ہی کی شائع کردہ کتاب ''ہمارے رہنما'' سے ماخوذ ہے۔ آپ اپنے ادارے کے توسط سے اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقا میں ''بچوں کے ادب'' کی جانب بھی سنجیدگی سے متوجہ ہیں۔

■ **امرلال، نزد مدہ چوک، ہنگولی، مہاراشٹر**

''اردو دنیا'' ایک رسالہ نہیں ایک تحریک ہے، ایک مشن ہے اور ملک میں اردو کی صورت حال کا آئینہ ہے۔ اس رسالے میں تمام موضوعات کا بخوبی احاطہ کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک ایک صفحہ ذہن و روح کو جلا بخشتا ہے۔ یہ اردو کے تاریخی کردار کا ترجمان اور گنگا جمنی تہذیب کا عکاس ہے۔ اردو زبان و ادب، تہذیب و ثقافت اور ہندوستان کی سیکولر روایات کی ترویج و ترقی میں جو رول ''اردو دنیا'' نے انجام دیا ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ امید کہ یہ رسالہ اسی طرح ملک و قوم کی خدمت کرتا رہے گا۔

■ **محمد علی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر، شعبۂ خوراک، حکومت مغربی بنگال، کولکاتا**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ (مئی 2005) موصول ہوا۔ سارے مشمولات توجہ طلب ہیں۔ ''ہماری بات'' میں آپ نے جن مسائل کی نشاندہی کی ہے ان پر فوری اور اجتماعی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ سیدہ جعفر کا مضمون معلومات افزا ہے۔ اظہار اثر کا مضمون میں نے دلچسپی اور توجہ کے ساتھ پڑھا۔ ان کی تحریر بہت خوب

اور معلوماتی ہے۔

■ **نفیس بانو، صدر شعبۂ اردو، وسنتا کالج فار ویمن، راج گھاٹ قلعہ، وارانسی -221001، (یوپی)**

''اردو دنیا'' پابندی سے مل رہا ہے۔ خدا کرے رفتارِ زمانہ سے پوری طرح باخبر یہ موقر جریدہ ترقی کی راہ پر یوں ہی گامزن رہے۔ قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے عالی جناب شمس الرحمٰن فاروقی جیسی جید شخصیت کا انتخاب سونے پہ سہاگہ ہے۔

■ **ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ، مئو ناتھ بھنجن (یوپی)**

سائنس اینڈ کائنات سوسائٹی آف انڈیا کی طرف سے آپ کو ملنے والا ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل ایوارڈ دراصل آپ کی مثبت فکر اور امتیازی طریقۂ کار کا اعتراف ہے۔ اس ایوارڈ کے لیے میری طرف سے پرخلوص مبارکباد قبول کریں۔

■ **امجد جاوید، حلیمہ ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ایس.ایف.ایس.، 13، ایم آئی جی، سیکنڈ، کے ایچ بی کالونی، وڈل گیرہ، نزد ہلال آباد، گلبرگہ -585104**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ ریاض پنجابی کا مضمون ''ادب، ادیب اور قاری ـــ مابعد نظریات'' موجودہ عالمی منظرنامے میں امریکہ کے بڑھتے ہوئے اثر سے واقف کراتا ہے۔ یہ صورتِ حال آج ادیب اور قاری کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ بعض جگہوں پر مجھے ایسا لگا کہ اس مضمون کے ابلاغ میں کہیں کچھ کمی ہے۔ شاید اس کی وجہ ہلکی سی غیر مربوطی ہو۔ عنوان اور مضمون میں بھی کہیں کہیں بُعد نظر آتا ہے۔ پھر بھی ریاض پنجابی کی یہ ایک اچھی کوشش ہے، میں انھیں مبارکباد دیتا ہوں۔ آج ہمارے قاری کو ایسے ہی مضامین کی ضرورت ہے۔

■ **انوار انصاری، اولڈ ہزاری باغ روڈ، مقابل چوتا بھٹہ، شانتی نگر، رانچی-1**

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے تقرر سے اردو زبان کی ترقی کی راہیں مزید ہموار ہوں گی۔ میری جانب سے فاروقی صاحب کو مبارک باد۔

''پٹرول کو الوداع''، ''سمندری لہروں سے توانائی کی فراہمی''، ''خوفناک سمندری لہریں'' سب بہترین مضامین ہیں۔ ''اردو دنیا'' میں ایسے مضامین شائع کرنے کے لیے مبارکباد۔

■ **ناشر نقوی، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ-147002**

''اردو دنیا'' کی روز بہ روز بڑھتی ہوئی مقبولیت کا سہرا، آپ کی قیادت میں آپ کے فعّال اسٹاف کے سر ہے۔ یہ امر باعثِ فخر ہے کہ قومی اردو کونسل کے ذمے داران اپنے فرائض کو ملازمت کم مشن زیادہ سمجھتے ہیں اس کا بیّن ثبوت ''اردو دنیا'' کی خوبصورت پیش کش ہے۔

■ **حیات افتخار، صدر شعبۂ اردو، قائدِ ملت کالج، میداوکم، چنئی**

آپ کی دانشمندانہ قیادت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اسی کے ساتھ ساری اردو دنیا کے ترجمان کی حیثیت سے ماہنامہ ''اردو دنیا'' بھی مقبول ہو رہا ہے۔ خدا کرے کہ آپ کی یہ کوششیں مزید بارآور ثابت ہوں۔

■ **اقبال نیازی، 40/18، غرائب حسین ہاؤس، قریش نگر، کرلا (ایسٹ)، ممبئی**

''اردو دنیا'' برابر مل رہا ہے۔ اس بار سلام بن رزّاق سے معاون مدیر فیروز عالم کی گفتگو بہت پسند آئی۔ اس کے مطالعے سے سلام صاحب کی زندگی کے اہم پہلو روشن ہوئے ہیں۔

■ **شیخ عبداللہ آکولوی (برطانیہ)**

''اردو دنیا'' مئی کا شمارہ صفحۂ اول سے لے کر صفحۂ آخر تک پُر از معلومات، دلنشیں، ذہن کی تاریکیوں کو دور کرنے والا اور آپ کی سنجیدہ کوششوں کا غماز ہے۔ خصوصاً سیدہ جعفر، رشید الدین، فیروز بخت احمد، مدن گوپال، سلام بن رزّاق، حبیب حق، محمد مجیب، گرجارانی استھانا کے مضامین پُرمغز ہیں۔

■ **محمد عمران راعینی، شیخ سرائے، پرانا سیتاپور (یو.پی.)**

''اردو دنیا'' اپریل کا شمارہ اپنے معلوماتی مضامین کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ ''اردو تعلیم: کیفیت اور تدابیر''، ''مولانا عبدالماجد دریابادی کی صحافتی خدمات''، ''ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں''، ''غالب اور بغاوت 1857''، ''پاور پوائنٹ کا تعارف'' دلچسپ اور معلوماتی مضامین ہیں۔ کوئز مقابلے کی شروعات بھی ایک اچھی پہل ہے۔

■ **سید صغیر احمد جعفری، (برطانیہ)**

اردو زبان پوری دنیا میں ایک عظیم، خوبصورت، مقبول اور رابطے کی زبان کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔ اردو کی مقبولیت میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ انگریزی کی اپنی اہمیت ہے، اسے پڑھیں لیکن ہرگز اردو کو فراموش نہ کریں، ساتھ ہی ساتھ ہماری علاقائی زبانوں کے فروغ کے لیے بھی کام کرتے رہیں۔ ہماری جانب سے نئی اردو ویب سائٹ ''اردو دنیا'' کے لیے بہت مبارکباد۔

□□□

ہماری بات

ڈاکٹر رفیق زکریا کی موت کے ساتھ ایک ایسا سماجی کارکن اور سیاست داں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا جس کی پوری زندگی ہندوستانی مشترکہ تہذیب کے فروغ کے لیے وقف رہی۔ نمایاں اوصاف کے حامل ڈاکٹر زکریا ایک ماہر تعلیم، اسلامی اسکالر، قلم کار، مجاہد آزادی، صحافی اور بااصول سیاست داں تھے۔ ان کو بنیاد پرست مسلمان ہندوؤں کا دوست اور فرقہ پرست ہندو مسلمانوں کا ہمدرد قرار دیتے تھے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک مخلص قوم پرست اور سیکولر انسان تھے۔ وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے ان کی وفات پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے انھیں ایک سچا محب وطن اور عظیم اسکالر قرار دیا۔

ڈاکٹر زکریا نے طالب علمی کے زمانے سے ہی سیاست میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے اس وقت سیاست میں قدم رکھا جب زیادہ پڑھے لکھے مسلمان اس میدان میں کم آئے تھے۔ انھوں نے اسمٰعیل یوسف کالج ممبئی سے گریجویشن کرنے کے بعد گورنمنٹ لا کالج میں داخلہ لیا۔ وہ اسٹوڈنٹ یونین کے جنرل سکریٹری بھی منتخب ہوئے۔ سیاست کے ساتھ ساتھ تعلیم پر بھی انھوں نے پوری توجہ صرف کی اور ایم.اے. کے امتحان میں ممبئی یونیورسٹی سے اول مقام حاصل کرنے کے لیے انھیں طلائی تمغہ ملا۔ 1944 میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے اور یونیورسٹی آف لندن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسمٰعیل یوسف کالج کی طلبہ یونین کی ذمے داریوں کے دوران ہی انھوں نے تحریک آزادی میں بہ گہری دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ ایک بار انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی کالج میں تقریر کرنے کے لیے بلایا۔ گاندھی جی سے پہلی بار ان کی ملاقات 1937 میں پونے میں ہوئی۔ ڈاکٹر زکریا شروع میں محمد علی جناح سے بھی متاثر تھے لیکن جب انھوں نے دوقومی نظریے کی بنیاد پر ملک کو تقسیم کرنے کی بات شروع کی تو ڈاکٹر زکریا نے ان سے اختلاف کیا۔ 1942 کی ''ہندوستان چھوڑو تحریک'' میں انھوں نے سرگرم حصہ لیا اور جیل بھی گئے۔ آزادی کے بعد انھوں نے مرکز اور ریاست میں کئی اہم عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ وہ راجیہ سبھا میں کانگریس کے ڈپٹی لیڈر اور 1962 سے 1977 کے دوران مہاراشٹر حکومت میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ڈاکٹر زکریا نے چار برس تک راجیہ سبھا کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے علاوہ اقوام متحدہ میں اپنے ملک کی نمائندگی بھی کی۔ موصوف قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے بھی وابستہ رہے اور گراں قدر مشوروں سے نوازتے رہے۔

تعلیم سے ڈاکٹر رفیق زکریا کو خاص شغف تھا۔ خصوصاً مسلمانوں کی تعلیم کے لیے وہ پوری عمر کوشاں رہے اور ممبئی اور اورنگ آباد میں انھوں نے کم از کم پندرہ کالج قائم کیے جنھیں سابق صدر جمہوریہ ہند آر وینکٹ رمن نے ''منی یونیورسٹی'' قرار دیا تھا۔ انھوں نے غریبوں کے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے اورنگ آباد میں ایک ہائی اسکول بھی قائم کیا۔

ڈاکٹر زکریا نے ہندوستان، اسلام اور برطانوی سامراج کے موضوع پر نہایت واضح، غیر جانب دارانہ اور منطقی طرز بیان میں متعدد کتابیں لکھیں۔ وہ تاریخ کے پس منظر میں عصری حالات و مسائل کا جائزہ لیتے تھے۔ ان کی پہلی کتاب "Rise of Muslims in Indian Politics" تھی جس نے ان کو ایک دانشور اور مورخ کے طور پر متعارف کرایا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ قومی اردو کونسل نے ''ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج'' کے نام سے شائع کیا۔ انھوں نے گاندھی جی کی سوانح "The Break up of India" نہرو کی سوانح "A Study of Nehru" جناح کی سوانح "The Man who Divided India" کے نام سے تحریر کی۔ دیگر موضوعات پر ان کی اہم کتابیں یہ ہیں:

The struggle within Islam, Conflict between religion and Politics, The Price of Partition, Sardar Patel and Indian muslims, Razia: Queen of India, Discovery of God and Iqbal, The Poet And the Politician, Communal rage in secular India, Indian muslims: Where have they gone wrong.

ممتاز صحافی اور انگریزی روزنامہ ''دی ایشین ایج'' کے مدیر اعلیٰ ایم.جے. اکبر نے Indian muslims: where have they gone wrong کے پیش لفظ میں ان کے بارے میں لکھا ہے: ''ایک ہندوستانی اور ایک مسلمان کے طور پر وہ اپنے ملک اور اپنے عقیدے دونوں کے تئیں یکساں وفادار رہے ہیں۔ ان کا ذہن بالکل صاف ہے اور وہ اپنے لوگوں کی بھلائی کے سوا کسی اور چیز کے متمنی نہیں ہیں۔ آج انگریزی میں لکھنے والا ایسا کوئی ہندوستانی مسلمان نہیں ہے جسے مسلمانوں اور ہندوؤں میں یکساں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہو۔''

اسلام کے بعض جہات کی توضیح و تشریح میں انھوں نے معتدل اور جدید نظریے سے کام لیا۔ وہ تاعمر دوقومی نظریے اور تقسیم ملک کے مخالف رہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر ملک تقسیم نہ ہوا ہوتا تو برصغیر کو بہت سارے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا اور ہمارا ملک مزید تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی جانب گامزن ہوتا۔ دنیا بھر میں اسلام کے نام پر ہونے والی دہشت گردانہ کارروائیوں سے وہ بے حد نالاں تھے اور مسلمانوں کو دہشت گردی کا راستہ چھوڑ کر اپنے مسائل کا پرامن حل تلاش کرنے پر زور دیتے تھے۔

عہد حاضر میں ہندوستانی تہذیب کے بنیادی ڈھانچے کو مضبوط بنائے رکھنے اور مسلمانوں کی بین الاقوامی شبیہہ کو عمدہ اور بہتر بنانے کے لیے ڈاکٹر رفیق زکریا نے جو کام کیا ہے اسے مسلسل آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر اے. ایم. پٹھان

بدلتا سماج اور اردو میڈیا کے لیے نئے مبارزات

سائنس اور ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی اور دورِ حاضر کی بدلتی قدروں نے آج انسان کو چاند پر چہل قدمی کا تو اہل بنا دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہر لمحہ زندگی کے نئے نئے مبارزات (چیلنج) کا بھی سامنا کر رہا ہے۔ سماج کی روز افزوں بدلتی قدروں کے پس منظر میں جب ہم اردو میڈیا بالخصوص اردو صحافت کے بارے میں غور کرتے ہیں تو اس شعبے کو شعوری اور غیر شعوری طور پر دو زمروں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ ایک اردو کا الیکٹرانک میڈیا اور دوسرا پرنٹ میڈیا یعنی صحافت۔

صحافت عوام کے لیے، عوام کے بارے میں تحریر کیا جانے والا مواد ہوتا ہے۔ اسے دن بھر کے واقعات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر منہ بولتی تصویروں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح قاری کی اس خواہش کی تکمیل ہوتی ہے جس کے تحت وہ ہر نئی بات جاننے کے لیے متجسس اور بے چین رہتا ہے۔ صحافت صرف اطلاع ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ کسی بھی مسئلے پر رائے عامہ کی تفسیر و تفصیل بھی پیش کرتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی صحافی کا نبض شناس ہوئے بغیر یا پلس ریڈنگ (Pulse Reading) سے واقفیت کے بغیر صحافی بن جانا ایسا ہی ہے جیسے خوشبو کے بغیر کوئی پھول۔ آج اردو صحافت کو وجود میں آئے تقریباً 186 سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس مدت میں اردو صحافت نے بھی دیگر تمام زبانوں کی صحافت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سماج کی تعمیر و ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ جنگِ آزادی کے دوران بھی دیگر زبانوں کے اخبارات کے مقابلے میں اردو اخبارات سب سے آگے تھے۔ آزاد ہندوستان میں بھی صرف اردو صحافت یا میڈیا ہی اپنا رول پوری ایمانداری کے ساتھ ادا کر رہا ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے صحافت کو جلدی میں لکھا گیا ادب (Journalism is a literature but in hurry) کہا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ تعریف بہت سے لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہو لیکن آج کے اس مشینی دور میں میتھیو آرنلڈ کے اس خیال کو قطعی طور پر مسترد بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ویکھم اسٹیڈ نے صحافی کی صلاحیتوں کے متعلق لکھا ہے کہ اسے قدیم و جدید فلسفے، تاریخ اور عصری سائنسی علوم کے متعلق مکمل معلومات ہونی چاہئیں۔ چونکہ صحافت ادب ہی کی ایک قسم ہے لہٰذا صحافتی مضامین میں محض حالات اور واقعات کے اظہار کے بجائے افکار و خیالات، حق و صداقت اور زبان و بیان کے اصولوں سے صحافی کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ شاید انسان اپنی انھی خصوصیات کی وجہ سے کائنات کی دیگر مخلوقات کے مقابلے میں افضل و اشرف سمجھا گیا ہے۔ چونکہ ایک صحافی زندگی کے عوامل پر کڑی نظر رکھتا ہے لہٰذا وہ زندگی سے بھرپور انسان کہلاتا ہے۔ صحافی کا بیدار ضمیر ہونا ضروری ہی نہیں ناگزیر ہے۔ فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور بے خوف ہو کر حقائق کو پیش کرنا صحافی کی اولین ذمے داری ہے۔ بلاشبہ آج دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہے لہٰذا دنیا کے کسی بھی حصے میں ہونے والے واقعے، حادثے یا کسی بھی معمولی یا غیر معمولی معاملے تک دنیا کے کسی بھی گوشے میں رہتے ہوئے ٹی وی کی بدولت ہماری رسائی آسان ہوگئی ہے۔ ویڈیو بوم کے اس دور میں جہاں سیکڑوں ٹی وی چینل چوبیسوں گھنٹے آپ کو اطلاعات و تفریح فراہم کر رہے ہیں، پرنٹ میڈیا بالخصوص اردو صحافت آج بھی اپنی بقا و شناخت کی کوششوں میں مصروف نظر آتی ہے۔ کیونکہ آج کا انسان سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وقت کے ہاتھوں مجبور ہے اور یہی وقت ان کے مطالعے سے ہمیں دور لے جا رہا ہے۔ ہندوستانی صحافت کے میدان میں آج اردو اخبارات تعداد اشاعت کے لحاظ سے چوتھے نمبر پر شمار کیے جاتے ہیں۔ پہلا مقام ہندی کو، دوسرا انگریزی اور تیسرا بنگالی زبان کے اخبارات کو حاصل ہے۔ ملک بھر سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کی کل تعداد لگ بھگ 1500 ہے۔ ان میں 150 سے زیادہ روزنامے اور تقریباً 700 ہفتہ وار شامل ہیں اور اس تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس طرح آزادی کے بعد اردو اخبارات کی تعداد میں تین گنا اضافہ ہوا ہے۔ جہاں تک اشاعت کا تعلق ہے، اردو اخبارات کی مجموعی اشاعت بھی حوصلہ افزا رہی ہے لیکن دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو اخبارات آج بھی بہت پیچھے ہیں۔ کشمیر سے کنیا کماری تک اردو اخبارات کی

● پروفیسر اے. ایم. پٹھان مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے وائس چانسلر ہیں۔

اشاعت اردو صحافت کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ یہی نہیں جدوجہد آزادی میں نمایاں رول ادا کرنے والی اردو صحافت آج بھی اپنا فرض بخوبی نبھا رہی ہے۔ اردو اخبارات میں بعض کثیر الاشاعت روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں کو بھی معیاری صحافت کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ اکثر اہم روزنامے اور ہفتہ وار ملک کے بڑے شہروں ممبئی، کلکتہ، دہلی، حیدرآباد، بنگلور اور سری نگر وغیرہ سے شائع کیے جاتے ہیں لیکن اگر اردو اخبارات کے معیار کا مقابلہ دوسری زبانوں کے اخبارات سے کیا جائے تو چند ایک کو چھوڑ کر کسی بھی اخبار کو معنوی اعتبار سے معیاری نہیں کہا جاسکتا۔ حیدرآباد، دہلی، ممبئی، سری نگر، لکھنؤ، کلکتہ اور جالندھر وغیرہ سے ہی چند روزنامے اور ہفتہ وار صحافتی معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اردو اخبارات میں آج بھی تحقیقی یا تجزیاتی مواد کی اشاعت نہیں کے برابر ہے۔ اس کے برخلاف اردو اخبارات میں دوسری زبانوں بالخصوص انگریزی زبان کے اخبارات کے مضامین اور خبریں ترجمہ کرکے شائع کرنے کا رواج ہے۔ اس کے علاوہ ادارتی عملہ یا مترجم بھی ان کی اشاعت سے قبل اس مواد کی چھان بین نہیں کرتے جس کے باعث بیشتر اردو اخبارات میں تازہ خبروں یا اطلاعات کے بجائے نامکمل خبریں یا پرانی خبریں اور اطلاعات ہی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ دیگر زبانوں کی طرح اردو اخبارات بھی خبررساں اداروں اور الیکٹرانک میڈیا پر ہی انحصار کرتے ہیں جبکہ دیگر زبانوں کی صحافت میں ان ذرائع کے علاوہ ان کے اپنے نمائندے بھی بڑی تعداد میں موجود رہتے ہیں۔

بدلتے سماج میں اردو میڈیا کے لیے درپیش مبارزات کے بارے میں غور کرنے سے ایک تلخ حقیقت یہ بھی سامنے آتی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی تیز رفتار ترقی سے آج پرنٹ میڈیا بالخصوص اردو صحافت کو بہت زیادہ نقصان ہوا ہے۔ مغربی تہذیب کے اثر انداز ہونے کے باعث جس طرح ہندوستانی فنون کی اہمیت میں کمی واقع ہوئی ہے اسی طرح الیکٹرانک میڈیا بالخصوص ٹیلی ویژن کے سیکڑوں چینلوں سے دن رات تفریح اور معلومات کی لمحہ بہ لمحہ پیشکش سے اردو صحافت شدید متاثر ہورہی ہے۔ جس طرح ہندوستانی موسیقی اور رقص پر مغربی رقص وموسیقی، ڈسکو، راک، یا پاپ کا اثر ہوا ہے اسی طرح اردو میڈیا بھی مغرب کے زیر اثر ہندوستانی تہذیبی اقدار بالخصوص صحافتی آداب کی پاسداری سے دور ہوتا جارہا ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں مذہبی اور اظہار خیال کی آزادی کے ساتھ ساتھ حق جانکاری کسی بھی شہری کا بنیادی حق ہے اور اس حق کا تحفظ صحافت کی ایک اہم ذمے داری ہے لہٰذا میڈیا کو مفاد عامہ کا ایک اہم ذریعہ بھی کہا جاتا ہے۔ بدلتے سماج میں اردو میڈیا کے لیے ایک اہم چیلنج یہ بھی ہے کہ بعض دوسرے شعبوں کی طرح اسے بھی تجارتی یا کمرشیلائزڈ بنا دیا گیا ہے۔ پیشۂ طب اور درس و تدریس کی طرح صحافت بھی ایک انتہائی دیانتدارانہ پیشہ ہے لیکن آج یہ راست یا بالواسطہ سرمایہ کاری کے رجحان سیاسی اور غیر سیکولر عناصر کے بڑھتے ہوئے عمل دخل کے باعث ترقی و بقا کی جدوجہد کررہا ہے۔ بدلتے سماج میں اردو میڈیا کے لیے درپیش نئے مبارزات سے مقابلہ کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اردو ذریعۂ تعلیم سے ایم اے ان ماس کمیونیکیشن اینڈ جرنلزم کا دو سالہ کورس شروع کیا ہے۔ کیمپس ایجوکیشن کے تحت چلائے جارہے اس کورس کے طلبہ کو نظریاتی تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی تربیت بھی دی جارہی ہے تاکہ میدان صحافت میں داخل ہونے پر ان طلبہ کو جدید تکنیک کے ساتھ ساتھ اپنی پیشہ وارانہ مہارت دکھانے کا موقع بھی مل سکے۔ اس کے لیے یونیورسٹی نے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے نمائندہ اداروں سے تعاون حاصل کیا ہے۔ آئندہ تعلیمی سال سے یونیورسٹی میں دو کروڑ کی لاگت سے ایک مکمل میڈیا سنٹر قائم کیا جارہا ہے جس میں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی تمام عصری سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ بدلتے سماج میں صحافت کو ایک مثبت کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اکیسویں صدی کے انقلاب نے زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح انسانی زندگی میں بھی زبردست انقلاب برپا کیا ہے اور اس انقلاب سے نمٹنے کے لیے اردو میڈیا یا صحافت کا رول بھی خاص اہمیت کا حامل ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو میڈیا کا اثر منفی زیادہ اور مثبت کم ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میڈیا بالخصوص اردو صحافت کے لیے بدلتے سماج میں جو نئے مبارزات ہیں ان کے مقابلے کے لیے قومی اتحاد و ہم آہنگی کے فروغ میں رکاوٹ پیدا کرنے والوں، فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والوں اور علاقائیت کا رجحان رکھنے والوں کی حوصلہ شکنی کے لیے اردو میڈیا رائے عامہ ہموار کرے اور اس عظیم ملک ہندوستان کی عظمت اور اس کے وقار کو بحال رکھنے میں اہم کردار ادا کرے۔ نئے مبارزات کے ضمن میں ایک اور بات کا خیال رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ اردو زبان کی بقا ہی ہماری آئندہ نسل کی بقا ہے۔ لہٰذا اس کی ترویج وترقی کی ذمے داری ہر اردو داں اور سیکولر ہندوستانی پر عائد ہوتی ہے۔ چونکہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں مختلف حالات ہیں اس لیے اردو زبان کی بقا وترقی کے لیے اہل زبان ہی بڑی حد تک ذمے دار ہیں۔ ہمیں مستقل مزاجی کے ساتھ اس مشن پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

زبیر رضوی

اردو اور ذرائع ابلاغ کا بدلتا منظر نامہ

آج کا دور بلا شبہ ذرائع ابلاغ کا ایک ایسا دھماکہ خیز دور ہے جس میں عام زندگی اور انسانی معاشرے کے طرز عمل اور اُس کے طرز اظہار پر ماس میڈیا کی گرفت پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط اور رہنما حیثیت کی حامل ہو گئی ہے۔ اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے حیران کن فروغ اور تیز رفتار پھیلاؤ نے ماس میڈیا کے مثبت اور منفی کردار کے درمیان حدِ فاصل کو بھی اب ایک سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ بظاہر ابلاغ کے جدید ترین ترسیلی ذرائع یہ باور کرانے کی کوشش میں لگے ہیں کہ وہ اپنی ذمے داریوں سے آگاہ ہیں اور یہ فریضہ بھی ان کی نئی نئی ترسیلی اختراعات اور ایجادات کا حصہ ہے کہ انھیں معاشرے کی ترقی اور اس کی ہمہ جہت جدید کاری اور اسے اجتماعی طور پر ترقی کی راہ پر لے جانے کا کام بھی انجام دینا ہے۔ ماس میڈیا کے تیز رفتار فروغ کو دیکھتے ہوئے غالب کی زبان میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں''۔ پیغام، خبر اور اطلاع کے تیز رفتار تبدیلی پسند ترسیلی ذرائع کا ایک تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ انٹرنیٹ اور سائبر کلچر پر کسی کا کنٹرول نہیں ہے۔ یہ ساری صورتِ حال خود رو گھاس کی طرح پورے کرۂ ارض پر ایک ایسے اطلاعاتی سبزہ زار کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے جس کی آبیاری اور تزئین کاری میں صارفی کلچر کے تجارتی مفادات کو فیض پہنچانے کو ترجیح حاصل ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، کیبل، نیٹ ورک، ہوم ویڈیو، سٹیلائٹ اور انٹرنیٹ نے دنیا میں اطلاعات اور نشریات کا ایک جال سا بچھا دیا ہے اور وسیع وعریض دنیا گھر آنگن بن گئی ہے۔ پل بھر کے وقفے سے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کوئی بھی وقوعہ جو دنیا کی دلچسپی کا باعث ہو، وہ ترسیلی ٹیکنالوجی کی مدد سے ہم تک پہنچ رہا ہے۔ ماس میڈیا نے اب علم اور جانکاری کی اُن بند کھڑکیوں کو بھی تازہ ہوا کے نام پر کھول دیا ہے جنھیں ہم نے ممنوع سمتوں میں کھلنے والی کھڑکیاں سمجھ کر بند کر دیا تھا۔ کل کے نو آبادیاتی نظام کی گرفت کو مضبوط بنانے میں جن سیاسی اور معاشی عوامل کا ہاتھ رہا تھا، آج کے ذرائع ابلاغ نے ان کی شکل بدل کے رکھ دی ہے اور آج ماس میڈیا دنیا میں جدید طرز کی نو آبادیات کو مستحکم کرنے میں اپنے پیغام رسانی کے حربوں کو پوری شدت اور قوت سے استعمال کر رہا ہے۔ عراق پر امریکی فوج کا تسلط اور وہاں اپنی پسند کی جمہوریت کا نفاذ اس کی تازہ مثال ہے۔ ماس میڈیا پر صارفی کلچر کو پھیلانے کے لیے اُسے ایک ایسے اوزار کے طور پر کہیں زیادہ استعمال کیا جا رہا ہے جس کی براہِ راست ضربوں سے انسانی معاشرہ اپنی روایتی تہذیبی اور معاشرتی پہچان سے محروم ہونے لگا ہے۔ اب میڈیا ہی صارفین کی پسند ناپسند، ان کے معاشرتی آداب و اطوار اور ان کے لیے اشیائے صرف کے استعمال کی ترغیب میں غیر معمولی کردار ادا کرنے لگا ہے۔ نشر و اشاعت کے پورے ترسیلی نظام میں تعلیم، معلومات اور اطلاعات کو جتنی جگہ ملی ہوئی تھی اب وہ حاشیے پر آتی جا رہی ہے اور اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسرے ذرائع ابلاغ میں تشہیر اور اشتہار بازی کا حصہ کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے اور اس طرح مقبول اور عام پسند ابلاغ کو فروغ دینے کی شعوری کوشش سے علم و ادب اور تہذیب و ثقافت سے متعلق موضوعات اور مواد پر تفریحِ طبع کو بالا دستی حاصل ہو گئی ہے۔ آج کا مقبول عام ابلاغ کا یہ بڑھتا ہوا رجحان، ہمارے جمالیاتی ذوق اور علم و دانش کو جلا دینے کی کوششوں سے عاری ہوتا جا رہا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے اندرونی مواد میں تفریح کے تصور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ تعلیم اور خواندگی کے فروغ کے لیے ابلاغ کی ترسیل کو ہلکا پھلکا بنانے سے اپنے مقصد کے حصول میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن ایک پریشان کن مسئلہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کو کیسے استعمال کیا جائے اور کیسے استعمال نہ کیا جائے کیوں کہ اس سلسلے میں کوئی نشریاتی حکمتِ عملی، رہنما اصول کی صورت میں موجود نہیں۔ اگر کوئی ایک ترسیلی وسیلہ اپنے لیے کچھ کوڈس بنا لیتا ہے تو دوسرا ترسیلی وسیلہ ان سب کی نفی کرنے کو اپنی خوبی اور امتیاز سمجھ لیتا ہے۔ مثال کے طور پر سرکاری پشت پناہی سے چلنے والے ہندوستانی ذرائع ابلاغ اگر شراب کی تشہیر نہ کرنے کے پابند ہیں تو دوسرے آزاد اور خود مختار ٹی وی چینل بلا کسی رکاوٹ کے شراب یا ممنوع قرار دیے گئے پروڈکٹ کے چلن کو عام کرنے میں اس کی تشہیر سے نہیں جھجکتے۔

ذرائع ابلاغ کے اس جدید تر منظر نامے میں اردو ذرائع ابلاغ کی صورتِ حال مرکزی منظر نامے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ آج کے اردو اخبارات کا اگر ہندوستان کے قومی پریس سے موازنہ کیا جائے تو لگتا ہے کہ ان اخبارات میں 'سیاست' اور 'انقلاب' جیسے ایک دو اخباروں کو چھوڑ کر باقی اخبارات اپنے محدود وسائل اور روایتی انداز کی سوچ اور فکر سے آگے بڑھنے میں اپنے تاملات کو نہیں جھٹک سکے۔ الیکٹرانک میڈیا میں ریڈیو پر بارہ گھنٹے کی آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے سوا کچھ ریاستی راجدھانیوں کے اردو

پروگرام ہیں جو اپنے مخصوص سامعین کو ہی اپنا مخاطب سمجھتے ہیں انھیں اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے نئے ساز و سامان سے واسطہ تو پڑتا ہے لیکن یہ سب کچھ ان کی ریڈیائی پیش کش میں منعکس نہیں ہو پاتا۔ بے شمار ٹیلی ویژن چینلوں میں صرف ایک ای ٹی وی نام کا ہمہ وقتی چینل ہے جو اپنی عمر کے چار پانچ سال پورے کرنے کے باوجود اردو گھرانوں کا محبوب نظر نہیں بن سکا۔ اس چینل کے سلسلے میں کوئی ایسا فیڈ بیک سروے بھی نہیں کہ جس سے اندازہ ہو سکے کہ یہ چینل اردو بولنے والے سماج کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کرنے کی اپنے اندر سکت پیدا کر سکا ہے۔ یہ صورتِ حال صرف ایک اردو کے ٹی وی چینل کی نہیں ہے دوسرے چینل بھی اپنے ہونے کا احساس دلانے اور ناظرین کی نظر میں اپنی پہچان بنانے کے عمل میں اپنے معاصر طاقتور چینلوں کی طرح اپنے کمیٹڈ ناظرین کا ایک بڑا حلقہ پیدا نہیں کر سکے۔ ایک وقت تھا کہ پاک ٹی وی کا قومی چینل اس کے سیریل اور دینی پروگرام سرحد کے اُس پار اردو سماج کو کسی قدر مانوس اور جانے پہچانے مسائل کا احساس دلاتے تھے لیکن پچھلے دس برسوں سے مختلف ٹی وی چینلوں کی نشریاتی اور اطلاعاتی حکمتِ عملی اور میڈیا میں خاص طور سے اردو بولنے والے معاشرے کے مسائل کو پیش کرنے میں جو کھلا پن اور اردو کو الیکٹرانک میڈیا میں زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے رجحان نے غیر اردو چینلوں کو اردو بولنے والے گھرانوں کے اطلاع، خبر اور معلومات اور تفریح کے تقاضوں کو پورا کرنے میں خاصی کامیابی دلائی ہے۔ فلم اور ریڈیو کی طرح ٹی وی کو بھی یہ احساس ہے کہ اردو میں دوسری علاقائی زبانوں کے مقابلے میڈیا کی زبان بننے کی صلاحیت اور خوبی کہیں زیادہ ہے کیوں کہ ذرائع ابلاغ زبان کو ایک اوزار کے طور پر استعمال کرنے میں یقین رکھتے ہیں اور وہ ایک Communicater کی حیثیت سے خبر اور اطلاع کی ترسیل میں زبان کو بطور وسیلہ استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے زبان وہی قابلِ قبول بنتی ہے جو کسی بھی چینل کے مطلوبہ ناظرین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی ترسیلی طاقت رکھتی ہو، اسی لیے اردو برصغیر کے عوامی ترسیل اور ابلاغ کے مختلف میڈیم میں ایک زندہ اور فعّال زبان کے طور پر تیزی سے اپنا لی گئی ہے۔ یہ صورتِ حال خبروں سے لے کر سیریل اور مختلف نوعیت کے دوسرے پروگراموں کے سلسلے میں ایسے ہی رویے کی حامل ہے۔

انٹرنیٹ اور ویب سائٹ کی سہولتوں نے مشرق و مغرب کے اجنبی معاشروں میں اردو نژاد باشندوں کو زبان اور تہذیب کی اجنبیت کے احساس کو ختم کرنے کا سنہری موقع فراہم کیا ہے۔ پیغام کی ترسیل کی اس جدید تر ٹیکنالوجی کی مدد سے اردو والے کو ایک اجنبی ملک میں رہتے ہوئے اپنی لسانی اور ثقافتی جڑوں کی جانب لوٹ جانے کا موقع حاصل ہوا ہے۔ رسالوں، کتابوں، روزناموں میں دن رات منتقل ہونے والا مواد اُن اردو والوں کی دسترس میں بھی آ گیا ہے جو انٹرنیٹ اور ویب سائٹ کی سہولتوں کو استعمال کرنے کو اپنی عادت اور مشغلہ بنائے ہوئے ہیں۔ دلّی میں اگر 'نوائے وقت' اور 'جنگ' کی سرخیوں اور اس کی خبروں سے روزانہ واقف ہونا ممکن ہے تو ادھر 'انقلاب' اور 'سیاست' جیسے ہندوستانی اخباروں کو انٹرنیٹ کے پھیلے ہوئے رابطوں میں ڈھونڈ کر پڑھ لینا آسان ہو گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو اپنی ترسیلی طاقت اور صلاحیت کی بنا پر قومی سطح پر ثقافت کے مرکزی دھارے میں اپنا رول ادا کر رہی ہے مگر اس زبان کو اظہار اور ترسیل کے طور پر استعمال کرنے والا ذرائع ابلاغ کا اردو منظر نامہ، اطلاعات اور نشریات کے معاملے میں اپنے سامع اور ناظر کو کسی اور چینل یا ترسیلی رابطے کی طرف رجوع کرنے سے بے نیاز نہیں کر سکا۔ اس سلسلے میں پاکستان میں ذرائع ابلاغ کا مسئلہ مختلف ہے کہ پاکستان میں اردو کی قومی زبان اور رابطے کی زبان کی حیثیت نے ذرائع ابلاغ پر اس کی بالادستی کو کسی اور زبان کی حاوی شرکت کے بغیر ایک حقیقت بنا دیا ہے۔ نئے ذرائع ابلاغ سے ہم آہنگ ہونے اور اُن کے پیشہ ورانہ تقاضوں کا ساتھ دینے میں اردو نے پاکستان میں اپنی ترسیلی طاقت کا بھرپور ثبوت فراہم کیا ہے۔ جنوبی ایشیا میں خاص طور سے اور ایشیا میں عام طور سے ذرائع ابلاغ پر حکمراں جماعتوں کا غلبہ اور تسلط رہا ہے اور وہ ذرائع ابلاغ کو اپنے انتخابی منشور اور سیاسی نظریات کی تشہیر کا آلۂ کار بناتی رہی ہیں۔ اس رویے نے میڈیا کے حوالے سے اظہار کی آزادی اور سنسر شپ کو بے حد گرم مباحثے کا موضوع بنایا ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہند اور پاکستان میں تصادم اور ٹکراؤ کی جو محاذ آرائیاں ہوتی رہی ہیں اُس کے بارے میں جنگی محاذوں سے رپورٹنگ کا فقدان رہا ہے۔ اُس نے غیر جانب دار خبر رسانی اور صورتِ حال کا صحیح نقشہ بیان کرنے میں میڈیا کی لن ترانیوں کو سامعین کی نگاہ میں مضحکہ خیز بنا دیا تھا اور صحیح صورتِ حال جاننے کے لیے ہندوستان اور پاکستان کے عوام کو کسی غیر جانب دار میڈیا کے میٹروں کو ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ اس معاملے میں پاکستان کے ذرائع ابلاغ کے مقابلے ہندوستان کی خارجہ اردو سروس کو محاذ آرائیوں کے دنوں میں بی بی سی کے مقابلے زیادہ اعتبار حاصل رہا اور یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستانی ذرائع ابلاغ نے ایک معتبر ترسیلی میڈیا کی صورت، اپنی خبروں کو مستند اور قابلِ اعتماد بنانے کا عمل اپنایا تھا۔

جنگ اور محاذ آرائی کے دنوں میں سچ کو جاننے کی بھوک کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی ہے۔ عراق کی صورتِ حال کے بارے میں میڈیا کے ایک بڑی طاقت کے کنٹرول میں رہنے کی وجہ سے تصویر کا صرف ایک ہی رخ سامنے آتا رہا تھا۔ دنیا عراق کے المیے کا کچھ سچ اُس وقت جان سکی تھی جب 'الجزیرہ'

جیسا آزاد عربی چینل تصویر کا اصل رخ پیش کرنے کے لیے ترسیل کی دوڑ میں شامل ہو گیا تھا۔

ہندوستان میں اردو ذرائع ابلاغ کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نشریاتی نیٹ ورک بڑی حد تک محدود وسائل کا حامل ہے اور اس میں دوسری زبانوں کے برابر کھڑے ہو کے اپنے ناظر کے معاشرتی تقاضوں کو پورا کرنے کی استعداد نہیں ہے۔ اس کے برخلاف پاکستان میں اردو پورے ماس میڈیا کا ترسیلی میڈیم ہے اور اس میں انگریزی کی طرح مختلف نوعیت کے چینلوں کو تجارتی اور تکنیکی تقاضوں کے ساتھ زندہ اور فعال رکھنے کی صلاحیت اور اہلیت موجود ہے۔ پاکستان میں ایسا اس لیے ممکن ہو پا رہا ہے کہ یہاں اردو کو ہر سطح پر فروغ پانے کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ہندوستان میں اردو کے اخبارات انگریزی تو بڑی بات ہے، وہ ہندی اور متعدد علاقائی زبانوں میں کئی ایڈیشنوں کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونے والے اخبارات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پٹنہ، لکھنؤ، بھوپال، جے پور اور احمد آباد سے اردو کا کوئی روزنامہ نہیں نکلتا، دلی، ممبئی، حیدرآباد، بنگلور اور سری نگر ہی ایسے شہر ہیں جہاں اردو کے ایک سے زائد روزنامے نکلتے ہیں۔ اس پس منظر میں دیکھیں تو اردو کا پرنٹ میڈیا انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ہانپتے کانپتے ساتھ دے رہا ہے اور وہ جو خبر، اطلاع اور معلومات کے میدان میں تیز رفتار سو میٹر کی سبقت لے جانے کی دوڑ ہو رہی ہے اُس میں اردو میڈیا تو شامل ہی نہیں ہے۔

نظریہ پسند ابلاغ کا مقصد اپنے سماجی نشانوں تک پہنچنا ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مقبول عام ابلاغ میں عام لوگوں کی دلچسپیوں کو اہمیت دی جاتی ہے اور ساری ترسیل عوام کے ذوق کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے۔ اس کے پس پردہ ذرائع ابلاغ کی طاقت کو صحیح زاویے اور نقطۂ نظر سے معاشرے کی اجتماعی ترقی اور اس نوعیت کے منصوبے کو حمایت اور تائید فراہم کرنے کے خیال سے نہیں کی جاتی۔ اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ ریونیو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی اس جدید صورت کے توانا ہوتے ہوتے اب وہ موڑ آ گیا ہے کہ ترقی پذیر ممالک ترسیل کی ان بھول بھلیوں میں اپنے متعین راستے اور ان کی سمتیں کھو بیٹھے ہیں اور تیر کمان سے چھوڑے جا چکے ہیں اور ترقی یافتہ ملکوں کے ذرائع ابلاغ کو استعمال کرنے کے طور طریقوں کو ترقی پذیر ملک ایک ماڈل کے طور پر استعمال کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جا رہے ہیں۔ اب محفوظ اور سرکاری احکام اور ہدایتوں کے پابند ذرائع ابلاغ میں خود مختاری اور اظہار کی آزادی کے نام پر پیغام رسانی اور اطلاعات اور معلومات کی ترسیل میں ایک ایسا کھلا پن آ گیا ہے جو اعلیٰ ذوق اور ترسیل کی اپنی جمالیات سے عاری ہے۔ اب ماس میڈیا از خود اپنی اطلاعاتی اور نشریاتی حکمت عملی طے نہیں کرتا اسے تجارتی گھرانوں کے بڑے بڑے خانہ ساز طے کرتے ہیں۔ اشتہار بازی میں اور اس کے ذریعے بوریاں بھر بھر کے ریونیو کی یافت میں اشیائے صرف بنانے والے کا حکم زیادہ چلتا ہے۔ یہ پروڈکٹ بنانے والا بتاتا ہے کہ اس کے بنائے صابن کی تشہیر میں لڑکی کا جسم کتنا بے لباس اور کیمرے کا فوکس جسم کے کن حصوں پر ہونا چاہیے۔ اس حکم اور ہدایت کو بجا لانے میں ماس میڈیا کے مختلف وسیلے اور ذرائع اپنا حصہ دوسرے سے کہیں زیادہ بنانے کی خاطر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ بالآخر نقصان معاشرے اور افراد کا ہوتا ہے۔

ذرائع ابلاغ کے سلسلے میں ایک نئی سوچ کا آغاز کرنے والے مارشل میک لوہن نے اپنی کتاب "Understanding Media" میں ابلاغ اور ذرائع ترسیل کے الگ الگ کرداروں سے بحث کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ سماج کو نئی شکل دینے میں فکر سے کہیں زیادہ ان میکانکی ذرائع کا ہاتھ ہوتا ہے جو فکر کی نشر و اشاعت کو ممکن بناتے ہیں۔ میک لوہن کی بات کی توسیع کی جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ترسیلی ٹیکنالوجی کی ترقی ہی ہے کہ جو ہماری دنیا کو ایک اطلاعی سماج کی صورت دے رہی ہے۔ میک لوہن اور آلون ٹافلر جیسے ذرائع ابلاغ کے شارحین نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ میڈیا کی پہلی صورت تو وہ تھی کہ جب بات چیت کے ذریعے خیال کی ترسیل کی جاتی تھی دوسری صورت نے اپنی نئی اثر پذیری کا فاتحانہ احساس دلایا اور یہیں سے ہم نے ماس میڈیا کے تصور کو آئینے کی صورت چمکانا شروع کر دیا۔ آج ذرائع ابلاغ خواہ وہ اردو کے ہوں یا کسی اور زبان کے، ان کی جو شکل و صورت ہمارے سامنے ابھر کر آئی ہے وہ اسی چمک دمک کا نقطۂ عروج ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ آج کا ذرائع ابلاغ ایک ایسا طاقتور ترسیلی اور اطلاعی فیوژن ہے جس نے جغرافیائی حدوں کے ساتھ ساتھ ابلاغ کی حدوں کو بھی بے معنی بنا دیا ہے۔ اب زندگی نئے آفاق اور نئے جہانوں کے دروازے کھولنے لگی ہے۔

آج میڈیا کسی بھی چہرے، صلاحیت، واقعے اور اطلاع کو راتوں رات ساری دنیا کی نگاہوں کا مرکز بنا سکتا ہے۔ میڈیا سے وابستگی یا پھر اس کا کسی کے بھی تئیں مہربان رویہ، اسے icon بنا سکتا ہے۔ میڈیا بت سازی اور امیج سازی اور بت شکنی اور امیج کو مسخ کرنے کے اپنے رویے میں شعلہ و شبنم بن گیا ہے۔ پاکستان کی ایک چھوٹی سی بچی نور فاطمہ جب علاج کے لیے ہندوستان لائی جاتی ہے تو میڈیا کی توجہ کا مرکز بن کر ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے لیے روشنی کا ایک ہالہ بن جاتی ہے۔ نور فاطمہ پر میڈیا کی توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت ہند کو اور ہندوستان کے کئی ہسپتالوں کو انسانی بنیادوں پر پاکستان کے بیمار بچوں کو مفت طبی سہولیات فراہم کرنے کی پیش کش کرنی پڑی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر ترسیل یا ابلاغ کا کوئی ایک میڈیم کسی شو یا واقعے کو سرخی

بنتا ہے تو دوسرا میڈیم اس کو اپنے زاویے سے رنگ دے کر اس کو اپنے میڈیم کا Scoop بنا لیتا ہے۔ میڈیا کی اس چکاچوند سے عوام میں پیدا ہونے والی غیر معمولی دل چسپی اور دھماکہ خیزی جب پُرسکون صورت اختیار کرتی ہے تو دیرپا اثر کے حامل ترسیلی میڈیم جیسے فلم انھیں اپنا موضوع بنا لیتے ہیں۔ ہم آسانی سے ان فلموں کی نشان دہی کر سکتے ہیں جن کی کہانی نے پہلے پہل خبر کی صورت اخبار، ریڈیو اور ٹی وی میں نمایاں جگہ پائی اور پھر وہ فلم کے میڈیم میں ایک نئے ویژن کے ساتھ سنیما دیکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گئے ایسی فلموں میں اشونی کمار کی Little Terrorist، امریکی فلم ساز مائیکل مور کی "Fahrenheit" برطانوی فلم ساز کینی گل نان (Kenny Glenaan) کی فلم 'یاسمین' سمیرا مخمل باف کی فلم "At five in the afternoon" اور فلم 'کایا ترن' کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ابلاغ کے جدید میڈیم ٹی وی میں رائے عامہ کو کسی بھی سمت میں وقتی طور پر بہا لے جانے کی جو طاقت ہے اس نے چھوٹے سے پردے والے اس بصری میڈیم کو ایک ایسا گلیمر دے دیا ہے جس نے دوسرے میڈیم کی چمک دمک کو ماند کر دیا ہے۔ صرف ایک رات کے وقفے سے میڈیا نے جس طرح ٹینس کی نئی دریافت ثانیہ مرزا کو اس کے کیریر کے بیچ ہی میں لپک لیا اور اسے سلیبریٹی بنا دیا وہ ماس میڈیا کی عوامی اپیل اور اس کے جادوئی کرشمے کی تازہ مثال ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ترقی پذیر ملکوں میں اس نئے میڈیم کا جو استعمال ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا اور اس پر صارف کلچر کی مضبوط گرفت اور حملے نے اسے ایک ایسا رخ اور صورت دے دی کہ جسے ترقی یافتہ ممالک بھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے۔ ان پہلوؤں پر غور کرنے کی غرض سے ہندوستان میں مختلف کمیٹیاں تشکیل دی جاتی رہی ہیں جن میں پارتھا سارتھی کی میڈیا صلاح کار کمیٹی، اشوک چندا کمیٹی اور پورن جوشی پینل کی رپورٹوں اور سفارشات پر عوامی مباحثے تو ہوئے مگر ابلاغی حکمتِ عملی کی تشکیل میں کوئی مثالی پیش رفت نہیں ہو سکی البتہ یہ بات شدت سے محسوس کی گئی کہ ابلاغی پالیسی کے تحت ثقافتی لین دین اور اطلاعات کی فراوانی پر پابندی عائد کرنی چاہیے تاکہ تبادلۂ خیال کے عمل کو منظم اور عوامی ذرائع ترسیل کو جمہوری بنایا جا سکے۔ جہاں تک سماج کی مختلف سطحوں پر جدید کاری کا معاملہ ہے تو اکثر حالات میں لوگ جدید کاری کو مغرب زدگی کا نام دیتے ہوئے اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ جدید کاری کے عمل کو غیر مغربی ماڈل کے طور پر اپنایا جائے کیوں کہ ترقی پذیر معاشرے عموماً اپنے تجربوں سے اپنے عمل اور ردِ عمل کی راہیں استوار کرتے ہیں۔ یونیسکو کی ایک رپورٹ کے مطابق بیشتر ترقی پذیر ممالک میں اطلاعاتی سہولیات بہت کم ہیں جن سے شہری اور دیہی علاقوں کے لاتعداد افراد کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یوں دیکھا جائے تو عوامی ذرائع ترسیل کے بڑے شہروں تک محدود رہنے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے اس کے علاوہ ناخواندگی، مذہبی ادعائیت اور تعصبات اور آمرانہ استبداد، غریبی اور تقدیر پرستی یہ سب ہی ذرائع ابلاغ کے معنی خیز پیغامات اور اطلاعات کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ سرکاری کنٹرول اور میڈیا کی خود مختاری اور آزادی اور سماجی فلاح و بہبود میں اس کے کردار کی صورت گری نے خاصے پیچیدہ سوالات اور مباحث کے لیے راہ ہموار کی۔

عوامی ترسیل اور ابلاغ دودھاری تلوار کی طرح ہے جس کا استعمال اگر ایک طرف معاشرتی اور سماجی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے میں معاون بنتا ہے، انسان کے لیے اظہار کی آزادی اور اس کی جمہوری خواہشوں کی آبیاری میں مدد کرتا ہے تو دوسری طرف آزادی کو کچلنے اور شخصی آمریت کو مستحکم کرنے، اقوام کے درمیان نسلی، مسلکی اور مذہبی اختلاف اور تنازعات کو ہوا دینے، دشمنی اور نفرت پھیلانے کسی خاص نظریے یا نعرے کی طرف عوام کو ہانکنے کا جرم بھی آمادگی سے انجام دیتا ہے۔ دراصل ذرائع ابلاغ کا استعمال ہی اس بات کا اشاریہ بنتا ہے کہ کسی ملک کے سیاسی، فکری اور ثقافتی زاویے کیا ہیں۔

اگر ہم ترقی پذیر ملکوں کی حیثیت سے ذرائع ابلاغ اور اس کی طاقتور اثر آفرینی کو دیکھیں تو ہمارے لیے آلون کرنن کے خیالات سے اتفاق کرنا ممکن نہ ہوگا کہ 'ادب کی موت ہو گئی ہے'۔ کرنن کے خیال میں مارکسی نظریہ پرستی اور نسائیت پسندی نے جب کتاب کو اپنے مقاصد اور نقطۂ نظر کا ترجمان بنانے کی کوشش کی تھی تو وہ کوشش دراصل مطبوعہ حرف کے بے اعتبار ہونے اور ترسیل اور ابلاغ کے نئے ذرائع کے ایک طاقتور حریف کے طور پر ابھر کر آنے کی وجہ سے تھی۔ دراصل مغرب میں ذرائع ابلاغ کی بالا دستی اور اس کی غیر معمولی تشہیری طاقت اور آمرانہ تحکم کے پیش نظر تاریخ کے خاتمے کا اعلان بھی ہوا اور کہا گیا کہ دراصل ہمارا دور مرگ انبوہ کا دور ہے جس میں انسان کئی طرح کی اموات کا گواہ بنا ہوا ہے۔

بیسویں صدی نے اپنے اختتام کے آخری دہے میں جس تیزی کے ساتھ ذرائع ابلاغ کو بدلنے اور ان میں نئی نئی صورتوں کو اجاگر ہوتے دیکھا ہے اس کے پیش نظر ابھی یہ کہنا ممکن نہیں کہ انسانی ذہن اپنی بات کہنے یا اپنے مخاطب کی بات سننے کے لیے ابلاغ کے اور کتنے ذرائع اختیار کرے گا۔ اس سلسلے میں میکسیکو کے ممتاز فلم ساز لوئس بونیل نے اپنے ایک انٹرویو میں دلچسپ انکشاف کیا تھا، اس نے کہا تھا:

"میرے خیال میں فلم کی موجودہ تکنیک اور اس کی نمائش کا طریقۂ کار بہت جلد از کار رفتہ ہو جائے گا کیوں کہ فلمیں ٹیکنالوجی پر کچھ زیادہ ہی انحصار

کرتی ہیں اور ٹیکنالوجی تیزی سے ترقی کرتی ہے اور فلمیں پرانی ہو کر آثارِ قدیمہ بن جاتی ہیں۔ اس لیے میں مستقبل میں ایک ایسی ٹیکنالوجی کا امکان دیکھ رہا ہوں جب فلمیں ایک چھوٹی سی گولی کے ذریعے دیکھی جائیں گی جو آپ کھالیا کریں گے پھر آپ اندھیرے میں بیٹھ جائیں اور خالی دیوار پر اپنی آنکھوں سے وہ فلم پروجیکٹ کریں جو آپ دکھانا چاہتے ہیں''۔

وان پیکرڈ نے اپنی کتاب 'دی ہیڈن پرسوایشین' میں ذرائع ابلاغ کے کسی بھی سماج پر اثر اندازی کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے کہ عوامی ذرائع ترسیل و ابلاغ ایک ایسی تہذیب کی تشہیر کر رہے ہیں جس کی کوئی اخلاقی، جمالیاتی یا ثقافتی اقدار نہیں ہیں، یہ پوری تہذیب دراصل ایک صارف معاشرے کی بنیاد ڈالنے اور اس کے لیے اشیائے صرف کی معیار بندی کرنے اور ترغیب کو عام کرنے کے تجارتی مقاصد اور ریونیو کی یافت میں اضافہ کرنے کے تاجرانہ مقاصد کی حامل ہے۔ اس تہذیب میں ذاتی فیصلے، ذاتی پسند، انفرادی تمیز و اختیار، جذبات اور احساسات کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تشہیری بیساکھیوں پر جینے والے یا پرورش پانے والے سماج میں اشیائے صرف کی افادیت اور اُن کے مفید ہونے کے برخلاف اُس کی امیج سازی پر زور دیا جاتا ہے یعنی میری ساڑی اس کی ساڑی سے اجلی کیسے؟ یہاں پروڈکٹ ثانوی ہے سبقت لینے کا انسانی جذبہ پروڈکٹ کی امیج سازی کی اساس بنتا ہے۔ اسی طرح امیتابھ بچن کی فلمی امیج اور تندولکر کی دھواں دھار بلے بازی اپنے پورے گلیمر کے ساتھ پروڈکٹ کے لیے عوامی Craze کو ہوا دینے کا سبب بنتی ہے۔ اس پس منظر میں ماس میڈیا کا سماج کے ترقیاتی منصوبوں میں اپنا ایک مثبت رول ادا کرنے کا فریضہ ایک پیچیدہ سوال بن جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال ذرائع ابلاغ کے اعتبار کو مشکوک اور بے جان بناتی ہے۔ یہاں میں یہ اعتراف کرتا چلوں کہ اردو اور دیگر عوامی ذرائع ابلاغ، فکر و ذہن کی سطح پر نئے زاویوں اور خیالات کا سرچشمہ نہیں بنتے کہ یہ کام گھر، خاندان اور درس گاہیں آج بھی انجام دے رہی ہیں۔ ضرورت دراصل اس بات کی ہے کہ ذرائع ابلاغ لوگوں کے فطری میلانات اور رجحانات اور ان کے معاشرتی اطوار اور آداب سے ہم آہنگ ہو کر تعلیم، معلومات، ترغیب اور تفریح کے تقاضوں کو پورا کرنے کا فریضہ دیانت اور سچائی کے ساتھ انجام دے، یہی آج کے اردو ذرائع ابلاغ کی دھماکہ خیز صورتِ حال سے ہماری مانگ ہو سکتی ہے۔

□□□

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب و تاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہو سکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالاتِ زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلامِ دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت: -/258 روپے

کلیاتِ علی سردار جعفری (جلد اوّل)

مرتب: علی احمد فاطمی

علی سردار جعفری ایک شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، صحافی، نقاد، مفکر اور دانشور ہی نہیں ادب، تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے گہرے رمز شناس بھی تھے۔ کونسل نے ان کی تمام تحریروں کو کلیات کی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔
اس سلسلے میں کلیات علی سردار جعفری کی پہلی جلد حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں ان کے مجموعہ ہائے کلام ''پرواز''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''خون کی لکیر'' اور ''امن کا ستارہ'' شامل ہیں۔

صفحات: 496، قیمت: -/164 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

سہیل انجم

اداریہ نویسی

اداریہ کسی ہنگامی واقعے یا کسی غیر معمولی خبر پر مدیر یا ناشر کا وہ اہم اور مبسوط مقالہ ہوتا ہے جو اخبار کی پالیسیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے تیار کیا جاتا ہے اور جس کے حوالے سے اس مخصوص واقعے کے بارے میں اخبار کی رائے قارئین تک جاتی ہے۔

ایف فریز بانڈ کا کہنا ہے کہ ''اداریہ ایک ایسا مضمون ہے جو ہنگامیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس ہنگامی مضمون کا مقصد اخبار کی رائے کا اظہار ہے''۔ کارل جی طر کے خیال میں ''اداریہ اس مضمون کو کہتے جو کسی ہنگامی موضوع پر لکھا گیا ہو اور جس میں قاری کی سوچ ایسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو جو مضمون نگار کی رائے میں صحیح ہو۔ اداریہ نویس قاری کو اپنے نقطۂ نظر سے متفق کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی باتیں لکھتا ہے جن سے قاری قائل ہو جائے اور موافق ردعمل ظاہر کرے''۔ میکس مُلر کا کہنا ہے کہ ''اداریہ ان رجحانات پر تبصرے کا نام ہے جو روز مرہ واقعات کی تہہ میں کارفرما ہوتے ہیں''۔ ڈاکٹر ایم لائل اسپنسر کا کہنا ہے کہ ''اداریہ رائے کو متاثر کرنے یا قاری کو محظوظ کرنے کے لیے حقائق اور نقطۂ نظر کو مختصر، منطقی اور خوشگوار انداز میں پیش کرنے کا نام ہے یا ایسی خبروں کی توجیہہ قرار دیا جا سکتا ہے جس سے تمام قارئین کسی خبر کو واضح طور پر سمجھ سکیں''۔ ولیم ایلین وائٹ کہتے ہیں کہ ''اداریہ وقت کے رجحانات یا خبروں پر ایسا آزادانہ اظہار خیال ہونا چاہیے جسے ایک ہمدرد اور عقلمند شخص نے جرأت کے ساتھ مختصر طور پر قلمبند کیا ہو۔ اداریے میں درشتی، تعصب اور خوف کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ یہ چیز خواہ کتنی ہی بے خوفی کا مظہر ہو اصل میں کمزوری کی علامت ہے''۔ مسکین علی حجازی کے خیال میں ''اداریہ نویس کی طرف سے کسی ہنگامی موضوع پر مباحثے میں تحریری طور پر حصہ لینے کا نام اداریہ ہے''۔

اداریہ دراصل کسی ہنگامی اور وقتی موضوع پر مدیر یا اداریہ نویس کی رائے ہوتی ہے۔ اس میں اخبار کی رائے بیان نہیں کی جاتی اور قاری سے اپنی بات کو منوانے کے لیے انتہائی مدلل اور پختہ انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ مدیر اداریہ کی مدد سے کسی مخصوص واقعے کو ایک خاص تناظر میں دیکھتا ہے اور اُسی تناظر میں قارئین کو بھی دکھانا چاہتا ہے۔ مضمون طویل ہوتا ہے اور اداریہ مختصر ہوتا ہے۔ اختصار ہی اداریے کی خوبی ہے۔ مضمون جہاں دو یا چار صفحات کا ہوتا ہے وہیں اداریہ ایک کالم یا دو کالم کا ہوتا ہے اور اس میں وہ تمام نکتے شامل کر لیے جاتے ہیں جو اداریہ نویس قارئین کے سامنے رکھنا چاہتا ہے۔ گویا اداریہ نویس ایک ایسا درزی ہوتا ہے جو ایک مختصر کپڑے کو کاٹ چھانٹ کر ایک مخصوص جسم کے مطابق بنا دیتا ہے۔ اداریہ تحریر کرنے سے قبل اداریہ نویس کے لیے لازمی ہے کہ وہ اہم نکات کا تعین کر لے اور انھی کی بنیاد پر اداریہ لکھا جائے۔ اس کے ذہن میں یہ واضح ہونا چاہیے کہ اسے کن نکات کو ابھارنا ہے اور کن نکات کے ارد گرد اپنی بات محدود رکھنی ہے۔ اداریہ نویس ایک خاص سوچ کو اپنی تحریر میں ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ دوسری غیر متعلق اور غیر ضروری چیزوں سے اجتناب کرتا ہے۔ وہ اپنی تحریر میں مخالفین کی رائے کا جواب دینے کی بجائے اپنی بات کو مدلل انداز میں رکھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ البتہ اگر برسبیل تذکرہ مخالفین کی رائے کا جواب دینا پڑے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی محض اشاروں اور کنایوں میں ہونا چاہیے۔ اداریہ موضوعاتی ہوتا ہے معروضی نہیں۔ اداریہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ اُسے زبان پر عبور حاصل ہو اور وہ جس موضوع پر اداریہ تحریر کرنے جا رہا ہو اُس کا اُس نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہو۔ مدیر کے لیے لازمی ہے کہ وہ کم لکھے مگر بہت اچھا لکھے اور اس انداز سے لکھے کہ اس کی باتیں قاری کے دل میں براہ راست اترتی چلی جائیں۔ گویا اداریہ نویسی دریا کو کوزے میں بند کرنے کا نام ہے اور یہ کام وہی انجام دے سکتا ہے جو دریا کی گہرائی و گیرائی سے واقف ہو اور کوزے کی تنگ دامانی سے بھی۔ تیز دریا کوزے میں بند ہونے کے باوجود دریا ہی رہے کوزہ نہ بن جائے۔

اردو اخبارات میں عام طور پر ایک ہی موضوع پر یعنی ایک ہی داریہ ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو اخبارات کے مدیر ہی اداریہ تحریر کرتے ہیں، اس لیے وہ ایک سے زائد موضوعات پر بیک وقت قلم برداشتہ لکھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ عموماً اردو اخبارات ایک اداریے کے لیے جتنی جگہ لیتے ہیں انگریزی اخبارات میں اتنی ہی جگہ میں دو تین اداریے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اردو اداریوں میں بہت سی غیر ضروری باتیں آ جاتی ہیں جو تحریر کو بوجھل اور گنجلک بنا دیتی ہیں، جب کہ انگریزی اخبارات میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں اداریہ تحریر کرنے والوں کا ایک پینل ہوتا ہے، لیکن اردو اخبارات

میں عموماً مدیر سیاسی اداریہ بھی لکھتا ہے، فلمی بھی لکھتا ہے، اقتصادیات پر بھی لکھتا ہے، کھیل کود پر بھی لکھتا ہے اور عالمی امور پر بھی لکھتا ہے۔ تاہم اردو کے بعض اخباروں نے یہ روایت قائم کی ہے کہ ڈیسک پر کام کرنے والے تمام سب ایڈیٹروں سے اداریے لکھوائے جاتے ہیں خواہ وہ لکھنے کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔ اردو اخبارات میں بھی ماہرین کا ایک پینل ہو اور اداریہ تحریر کرنے سے قبل وہ پینل آپس میں گفتگو کرے کہ کن نکات کو ابھارنا ہے اور کن کو دبانا اس پر تبادلۂ خیال کرے، اور پھر جس موضوع کا انتخاب ہو اس کے ماہر کو اداریہ تحریر کرنے کی ذمے داری دی جائے اور پھر اخبار کا مدیر اس پر نظر ثانی کرے، اگر ضروری ہو تو اس کے نوک پلک سنوارے اور اگر کسی نکتے پر اداریہ اخبار کی پالیسی کے دائرۂ کار سے باہر نکل رہا ہو تو اس کو درست کرے، اس کے بعد ہی اسے اشاعت کے لیے بھیجے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں سے اداریے تحریر کرائے جانے ہوں پہلے ان کو اس کی تربیت دی جائے اور جب وہ اداریہ نویسی کے فن میں طاق ہو جائیں تب ہی انھیں یہ ذمے داری سونپی جائے۔ جن دنوں اردو کے سرکردہ صحافی حیات اللہ انصاری اور دہلی اردو اکادمی کے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ سے سرفراز عشرت علی صدیقی روز نامہ ''قومی آواز'' کے مدیر ہوا کرتے تھے اس زمانے میں انھوں نے اس کی ایک روایت شروع کی تھی۔ عشرت علی صدیقی پورے ایک سال تک قومی آواز کے موجودہ ایڈیٹر موہن چراغی سے اداریے لکھواتے رہے۔ بقول موہن چراغی وہ اداریہ لکھتے، عشرت علی صدیقی اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی اور اصلاح کرتے اور پھر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے، ایک سال بعد انھوں نے موہن چراغی کی تحریر کو اس لائق سمجھا کہ اسے اداریہ بنایا جا سکے۔

اداریے کے لیے ایک جگہ مخصوص ہوتی ہے اور اسے ہمیشہ اسی جگہ پر ہونا چاہیے اداریہ عموماً ایڈیٹ پیج یا ادارتی صفحہ پر ہوتا ہے جہاں اہم مضامین بھی ہوتے ہیں۔ تاہم بہت خاص مواقع پر صفحہ اول پر بھی اداریہ شائع ہوتا ہے جیسے پنڈت نہرو کی موت، اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کے قتل، بابری مسجد کے انہدام، سابرمتی ایکسپریس میں آتش زنی اور گجرات فسادات وغیرہ پر بیشتر اخباروں نے صفحۂ اول پر اداریہ شائع کیا تھا۔

ایک صحافی کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اخبارات کے اداریے پڑھے تاکہ اس کی معلومات مکمل رہے۔ بہ دیگر الفاظ ایک صحافی کو پوری طرح باخبر ضرور ہونا چاہیے اور قومی و بین الاقوامی حالات پر اس کی گہری نظر ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں اگر انگریزی اور اردو کے اخباروں اور قارئین کا موازنہ کیا جائے تو حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ جہاں انگریزی کے قارئین اداریہ خوانی میں عموماً دلچسپی نہیں رکھتے، وہیں اردو کے قارئین انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ اداریے پڑھتے ہیں۔ عموماً نچلے طبقے کے قارئین چھوٹے چھوٹے چائے خانوں میں بیٹھ کر دن بھر اردو اخبارات پڑھتے ہیں ساتھ میں اداریہ بھی۔ علاوہ ازیں اس کے مختلف پہلوؤں پر بھی بحث کرتے ہیں۔ میں شہروں کی بات نہیں کرتا مگر قصبوں اور دیہاتوں میں یہ روایت بہت پرانی ہے اور بہت سی جگہوں پر اب بھی قائم ہے۔ انگریزی اور ہندی اخبارات کے قارئین اپنے مدیروں کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کی ہر بات کو صداقت پر مبنی سمجھتے ہیں خواہ اس میں دروغ بیانی اور مبالغہ آرائی کے عناصر ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ ایڈیٹروں سے عقیدت بھی رکھتے ہیں اور ان کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ اردو کے قارئین اپنے پسندیدہ اخباروں کے مدیروں کو خطوط لکھ کر مشورے بھی دیتے تھے کہ فلاں موضوع پر اداریہ لکھا جائے۔ اردو کے ہفت روزہ اخباروں کی بات کی جائے تو بنگلور سے شائع ہونے والے اخبار ''نشیمن'' کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جن دنوں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف قتل کا مقدمہ چل رہا تھا ''نشیمن'' کی اشاعت کم وبیش ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ جو اپنے اداریوں میں صدر صدام حسین کی کھل کر حمایت کرتے تھے۔ الجمعیۃ کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط اور پرتاپ کے ایڈیٹر مہاشے کرشن میں چلنے والی چشمک ان اخبارات کے قارئین ابھی بھی نہیں بھولے ہوں گے۔ ایک روز مہاشے کرشن مولانا فارقلیط پر جارحانہ حملہ کرتے اور قارئین اس انتظار میں رہتے کہ مولانا کیا جواب دیتے ہیں اور جب مولانا جارحانہ تیور اختیار کرکے مہاشے پر یلغار کرتے تو یہ انتظار ہوتا کہ مہاشے جی کیا جواب نکال کر لاتے ہیں۔ اس چشمک نے جہاں اداریہ نویسی کے میدان میں ایک نئی شروعات کی تھی وہیں اس نے دونوں اخبارات کی تعداد اشاعت میں بھی زبردست اضافہ کر دیا تھا۔

اردو اخبارات کے اداریے نسبتاً طویل ہوتے ہیں اور بعض دفعہ قسط وار لکھے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ برسوں قبل دہلی سے شائع ہونے والے روز نامہ ''فیصل جدید'' کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اس کے مدیر ایس ایم عثمان اتنے طویل اداریے لکھتے تھے کہ اس کے اوپر لکھا ہوتا تھا ''کل کا بقیہ'' اور آخر میں لکھا ہوتا تھا '' بقیہ کل''۔ اداریے کی زبان اور معیار سے قطع نظر قارئین بہت دلچسپی سے وہ اداریے پڑھا کرتے تھے۔ یہاں ایک مذہبی رسالہ التوعیہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو مرکز ابوالکلام آزاد جوگا بائی نئی دہلی سے کئی برسوں تک شائع ہونے کے بعد بند ہو چکا ہے۔ وہ رسالہ بڑی تقطیع پر نکلتا تھا اور اس کے اداریے پندرہ بیس اور پچیس صفحات کے ہوتے تھے اور اس کے قارئین بہت اشتیاق کے ساتھ رسالہ پڑھا کرتے تھے۔ دراصل انگریزی اور اردو زبان میں بنیادی فرق انداز تحریر کا ہے۔ انگریزی کا انداز الگ ہے اور اردو کا انداز جدا

ہے۔ اور اردو کی جداگانہ طرزِ تحریر ہی اس کے اداریوں میں شیرینی اور مٹھاس پیدا کرتی ہے روزنامہ "اردو ٹائمز" کے مدیر خلیل الرحمٰن نے ایک ملاقات میں بتایا کہ ان کے اخبار کی اشاعت اسّی ہزار 80,000 ہے اور قارئین کی نصف تعداد محض اخبار کا اداریہ پڑھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خوبی اردو اسلوبِ نگارش کی ہے کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کے اردو قارئین بھی اداریوں میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ اردو زبان کا خاصہ اور اس کی صحافت کا امتیازی وصف ہے اور یہ خوبی شاید دوسری زبانوں کی صحافت میں نہیں ہے۔

اردو میں اداریوں کی ابتدا اخبارات سے ہوئی۔ "دہلی اردو اخبار"، "اودھ پنچ" اور "اخبار جمہور" وغیرہ کے اداریے خاصے کی چیز ہوا کرتے تھے۔ جنگِ آزادی کے دوران اخبارات کے اداریے مجاہدین کی رگوں میں دوڑنے والے خون میں حدت پیدا کر دیتے تھے اور عوام میں بھی ان اداریوں سے زبردست جوش پیدا ہوتا تھا۔ روزنامہ اخبارات میں ادبی اداریوں کی گنجائش نہیں ہوتی، اس کمی کو اردو کے ادبی رسائل نے پورا کر دیا۔ ادبی رسائل کے اداریوں میں اختصار کی کوئی قید نہیں ہے۔ ان میں عصری اور ادبی مباحث پر اداریے تحریر کیے جاتے ہیں۔ "کتاب نما" کے مدیر شاہد علی خاں نے ایک نئی روایت شروع کی اور وہ باہر سے اداریے لکھوانے لگے۔ اسے مہمان اداریہ اور اداریہ نویس کو مہمان مدیر کہا جاتا ہے۔ یہ اداریہ کسی ادبی، لسانی یا صحافتی موضوع پر دراصل ایک بھرپور مضمون ہوتا ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا فائدہ "کتاب نما" کے مدیر کو یہ ہوا کہ وہ اداریہ لکھنے سے بری الذمہ ہو گئے، لیکن اس کا سقم یہ ہے کہ اس میں کوئی ایک مخصوص پالیسی نہیں اپنائی جا سکتی۔ لکھنے والا آزاد ہے اور "فری فار آل" کے فارمولے پر عمل کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ اداریے بہت گراں قدر اور جامع ہوتے ہیں اور کتاب نما کے مہمان مدیران میں شمس الرحمٰن فاروقی اور شمیم حنفی سمیت اردو کی متعدد قد آور شخصیات شامل ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ پرنٹ میڈیا کی مانند الیکٹرانک میڈیا میں بھی اداریہ سازی یا اداریہ نویسی کی روایت ہے تو شاید آپ چونک پڑیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وائس آف امریکہ اردو سروس نے یہ روایت شروع کی ہے۔ وہ روزانہ تو نہیں البتہ ہر دوسرے تیسرے روز کسی خاص موضوع یا کسی خاص واقعے کو امریکی حکومت کی پالیسیوں کے رنگ میں رنگ کر پیش کرتا ہے اور اس کا عنوان ہوتا ہے "امریکی حکومت کی پالیسیوں کا ترجمان۔ آج کا اداریہ" لیکن کسی دوسرے ریڈیو اسٹیشن یا نیوز چینل پر ایسی کوئی روایت نظر نہیں آتی۔

بہ اعتبار مجموعی اداریہ نویسی جہاں ایک بہت اہم فن ہے وہیں اس کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں اور صحافتی ادب کی تاریخ میں اداریہ نویسی کی انفرادیت وافادیت ہمیشہ قائم رہے گی۔

246، ذاکر نگر ویسٹ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔25

□□□

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

مولانا ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ ان کے سیاسی تدبر، علمی فتوحات اور صحافتی خدمات پر کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ کم ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ انھیں سائنس سے بھی بے حد لگاؤ تھا اور انھوں نے آزادی کے بعد بطور وزیرِ تعلیم ملک کو سائنسی اور ٹیکنالوجیکل ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے

تنقید عقل محض

مصنف: ایمانوئل کانٹ، مترجم: ڈاکٹر سید عابد حسین

یہ جرمن مابعد طبعیاتی فلسفے کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے جو براہِ راست جرمن زبان سے کیا گیا ہے۔ فاضل مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین نے مصنف کے خیالات کی وضاحت اور زبان کی سلاست کو بطور خاص ملحوظ رکھا ہے اور منشائے مصنف تک قارئین کی رسائی کو آسان کر دیا ہے۔ یہ کتاب 1948 میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کی تھی۔ اس کی افادیت کے پیش نظر انجمن اور محترمہ صغریٰ مہدی کی اجازت سے کونسل نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

صفحات: 488، قیمت: -/158 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

اعجاز مسیح

آموزش بذریعہ امداد باہمی

اکثر آموزش سے روایتی کلاس روم میں یہ مطلب لے لیا جاتا ہے کہ آموزش محض وہ معلومات ہے جو کسی طالب علم کو درجے میں استاد یا نصابی کتب کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، جس کو اپنی یادداشت کی بنیاد پر دُہرایا جاسکتا ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں یادداشت کی صلاحیت ہی آموزش ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آموزش کا یہ تصور بہت ہی ناقص اور نامکمل ہے۔ بامعنی آموزش تو درحقیقت رویے میں مثبت تبدیلی اور ترمیم کا نام ہے جس کے اثر سے اس کے کردار کا وقوفی (Cognitive)، تاثراتی (Affective) اور محرکی (Psychomotor) پہلو اچھوتا نہیں رہ سکتا۔ چونکہ انسان ایک سماجی ذی روح ہے اس لیے انسان کی آموزش ہمیشہ ایک سماجی ماحول میں ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کسی بھی انسان کے اردگرد رہنے والے دوسرے لوگ اس کی فکر اور کردار کو متاثر کرتے ہیں اور کسی بھی چیز کے معنی جو انسان اپنے دماغ میں تخلیق کرتا ہے، وہ اپنی اس کوشش میں ان دوسرے لوگوں سے جو اس کے گرد موجود ہوتے ہیں، بالواسطہ طور پر متاثر ہوتا ہے۔ چونکہ دوسرے کا اثر اور اس کے ذریعے ملنے والی بازافزائش سب سے بہتر طریقے سے آپس میں تفاعل، تبادلۂ خیال، بحث و مباحثہ اور امداد باہمی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اس لیے حقیقی اور بامعنی آموزش کے لیے کسی بھی درجے میں تعاون اور امداد باہمی کا ماحول درکار ہوتا ہے اور اس ماحول میں محض استاد اور درسی کتاب ہی آموزش کے ذرائع نہیں ہوتے بلکہ ہم جماعت طلبہ ایک بہت اہم ذریعہ ہوتے ہیں اور آپسی تعاون و اشتراک کے ماحول میں جب طلبہ ٹولیوں میں ایک ساتھ کسی مسئلے پر غوروخوض اور بحث و مباحثہ کرتے ہیں اور مشترکہ تجزیہ کے ذریعے اتفاق رائے سے کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں تو اس طرح ہونے والی آموزش زیادہ بامعنی اور دیرپا ہوتی ہے اور ایسی آموزش کو آموزش بذریعہ امداد باہمی کہتے ہیں۔ چونکہ اس صورت میں سبھی طلبہ کی آموزش ایک ساتھ ہوتی ہے اور سبھی طلبہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے تجربات اور غوروفکر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود بھی سیکھتے ہیں اور دوسرے کی آموزش میں بھی معاون و مددگار ہوتے ہیں اس لیے یہ آموزش نہ صرف زیادہ پرمعنی و دیرپا ہوتی ہے بلکہ زیادہ فطری اور دلچسپ بھی ہوتی ہے۔ آموزش کے اس طریقے کو آج اس کی ان خوبیوں کی بنا پر درجے میں اپنانے پر زور دیا جانے لگا ہے اور گذشتہ ایک دہائی میں اسے مختلف مضامین کی تدریس میں اپنایا گیا ہے۔ آموزش بذریعہ امداد باہمی میں گروپ کا ہر رکن استاد اور ہر رکن شاگرد ہوتا ہے۔ یہاں سب ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں اور آموزشی عمل کو آگے بڑھانے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ کسی مواد یا مسئلے کو سمجھنے اور آموزشی عمل کو آگے بڑھانے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور کسی مواد یا مسئلے کو سمجھنے میں ایک دوسرے کا تعاون حاصل کرتے ہیں۔

آموزش بذریعہ امداد باہمی کی اہمیت سے آج شاید ہی کوئی استاد انکار کرسکتا ہے۔ آموزش بذریعہ امداد باہمی کا صحیح تصور ذہن نشین کرنے کے لیے تین اصطلاحات کے معنی اور ان کا فرق سمجھ لینا ضروری ہے۔ یہ اصطلاحات ہیں: (1) باہمی تعاون کرنا سیکھنا (Learning to Co-operate) (2) آموزش کے لیے امداد باہمی (Cooperate to Learn) اور (3) باہمی تعاون کے ساتھ کام کرنا سیکھنا (Learning to Work Cooperatively)۔ کسی دوسرے شخص کا کام کرنے یا مسئلے کا حل کرنے میں مدد و تعاون کرنے کی صلاحیت اگر آپ نے پیدا کرلی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ نے باہمی تعاون کرنے کی مہارت سیکھ لی ہے۔ اس کے برخلاف آموزش کے لیے امداد باہمی کے عمل کا مطلب یہ ہے کہ مختلف طلبہ آپس میں اس طرح تعاون و اشتراک کریں کہ اس کے نتیجے میں سبھی کی آموزش ہو پائے اور خود کے ساتھ ساتھ دوسروں کی آموزش کے لیے بھی ہر شخص ایک دوسرے کا معاون ہو۔ جہاں تک تیسری اصطلاح کا تعلق ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کسی بھی گروپ میں ساتھ کام کرنے والوں کے اندر یہ صلاحیت اور جذبہ پیدا کیا جائے یا ان میں اس کی آموزش ہوجائے کہ وہ گروپ کے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون و اشتراک کریں۔ مگر ساتھ کام کرنے کی استعداد کی آموزش کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لازماً طلبہ ایک دوسرے کی معاونت اس طرح کر پائیں گے کہ ہر طالب علم کی آموزش اس حد تک ہوجائے جتنا اسے ہونا چاہیے تھا۔

آموزش بذریعہ امداد باہمی کے لیے مندرجۂ بالا تینوں باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ عام طور پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ طلبہ درجے میں اگر ایک ساتھ گروپ میں کام کررہے ہیں تو یہی آموزش بذریعہ امداد باہمی کا عمل ہے۔ مگر

محض ایک ساتھ کام کرنا آموزش بذریعہ امداد باہمی کی پہلی شرط ہے۔ اس کے علاوہ تمام طلبہ کا عملی طور پر ایک دوسرے سے تعاون کرنا اس لیے ضروری ہے کہ گروپ کے لیے جو ہدف متعین کیا گیا ہے وہ حاصل ہو جائے۔ یہ آموزش بذریعہ امداد باہمی کی دوسری شرط ہے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ باہمی اشتراک و تعاون کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک کہ گروپ میں موجود ہر طالب علم کی آموزش طے کیے ہوئے نشانے تک نہ پہنچ جائے۔

اس طرح آموزش بذریعہ امداد باہمی کے لیے لازم ہے کہ درجے میں موجود طلبہ کو مختلف ٹولیوں (گروپ) میں منقسم کیا جائے۔ پھر ہر گروپ کو اپنے ہدف کے حصول کے لیے مل کر کام کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ گروپ کے ممبران کا آپسی تعاون و اشتراک محض گروپ کے ہدف کے حصول تک محدود نہ ہو کر ہر ممبر کی آموزش پر مرکوز ہو اور اس کے لیے مشترکہ غور و خوض، بحث و مباحثہ اور مسئلے کا مشترکہ تجزیہ اور ان سب کے نتیجے میں مسئلے کا اتفاق رائے سے حل تلاش کرنے کی کوشش کی جائے اور ان سب اقدامات کے دوران کسی بھی ممبر کو پیش آنے والی دشواریوں کو مل جل کر دور کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ گروپ کے ہر ممبر کی نہ صرف خود کی دیے گئے مواد سے متعلق ادراکی، تاثراتی اور حرکی سطح پر آموزش ہو جائے بلکہ دوسرے ممبران کی آموزش کا حصول بھی یقینی بن جائے۔

دوسرے لفظوں میں آموزش بذریعہ امداد باہمی گروہی آموزش کا وہ عمل ہے جس میں گروپ کی ساخت اور اس گروپ کے کام (Group Task) کا تعین زیادہ باضابطہ انداز میں کیا جاتا ہے اور گروپ میں شامل تمام طلبہ باہمی تعاون و اشتراک سے نہ صرف اپنے گروپ کے لیے متعین ہدف کے حصول کے لیے عملی سعی کرتے ہیں بلکہ یہ ایک دوسرے کا تعاون کر کے، ہر ممبر کی مہارت کی حد تک، آموزش کو یقینی بناتے ہیں۔

آموزش بذریعہ امداد باہمی کی مندرجۂ ذیل خصوصیات اسے کسی بھی دوسرے طریقۂ تدریس سے ممتاز کرتی ہیں۔

(1) اس طریقے میں روایتی طریقۂ تدریس کے مقابلے میں آموزش کے لیے داخلی محرکہ (Intrinsic Motivation) زیادہ کارفرما ہوتا ہے۔

(2) تنقیدی استدلال کی صلاحیت اور کام میں اسے اپنانے کی مہارت پیدا کرنے میں زیادہ معاون ہوتا ہے۔

(3) سبھی طلبہ کو بغیر رکاوٹ کے انفرادی طور پر اور بہ طور گروپ ممبر باہمی تعاون کے ماحول میں آموزش کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

(4) آموزش کو مہارت کی حد تک حاصل کرنے کے لیے سبھی طلبہ کو زیادہ فطری مواقع فراہم کرتا ہے۔

(5) متفقہ و مشترک مقصد کے حصول کے لیے گروپ کے سبھی طلبہ کو اشتراک و تعاون کے ماحول میں ایک ساتھ کام کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

(6) طلبہ میں دوسروں کے ساتھ کام کرنے کے لیے درکار مثبت رویہ پیدا کرتا ہے۔

(7) طلبہ میں استاد، مضمون اور اسکول کے لیے بھی مثبت رویہ پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ آموزش بذریعہ امداد باہمی کا طریقہ استعمال کرنے کے لیے کسی استاد کو مندرجۂ ذیل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

1. گروپ کے لیے کام (ہدف) اور مضامین سے متعلق آموزشی مقاصد کا واضح تعین:

آموزش بذریعہ امداد باہمی کے طریقے کو بطور طریقۂ تدریس اپنانے کے لیے استاد کو سب سے پہلے ان کاموں کی واضح نشاندہی کرنی ہوگی جو درجے کے طلبہ کی مختلف ٹولیوں کو تفویض کیے جائیں گے۔ لیکن جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے کہ آموزش کا مقصد محض گروپ کے لیے تفویض شدہ مقصد کا حصول ہی نہیں ہوتا بلکہ مضمون سے متعلق ادراکی، تاثراتی اور حرکی آموزشی مقاصد کا حصول بھی ہوتا ہے۔ اس لیے ابتدا ہی میں ان مقاصد کی پہچان اور ان کا واضح تعین کر لینا بھی استاد کے لیے لازم ہوتا ہے۔

2. گروپ کی تشکیل:

استاد کا دوسرا کام درجے کے طلبہ کو ٹولیوں میں تقسیم کرنا ہوتا ہے۔ درجے میں موجود طلبہ کو مختلف گروپوں/ٹولیوں میں اس طرح بانٹنا کہ سبھی ٹولیوں میں مختلف تعلیمی استعداد کے طلبہ موجود ہوں۔ تعلیمی استعداد کے علاوہ لسانی، سماجی و معاشی معیار کے اعتبار سے بھی اگر ہر ٹولی میں طلبہ مختلف ہوں تو بہتر ہوگا۔ ٹولیاں بناتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیے کہ عموماً ایک ٹولی میں ایسے طلبہ ہوں جو ایک دوسرے کے گہرے دوست نہ ہوں۔

3. گروپ کو واضح ہدایت دینا:

گروپ کو دی جانے والی ہدایات کے اہم پہلو اس طرح ہوں گے: ہر ایک ٹولی کو ان کا کام سپرد کرنا، اس کے حصول کے لیے مشترکہ ذمّے داری ٹولی کے سبھی ارکان کو دینا، ہدف کے حصول کے لیے ٹولی کے ممبران کو کچھ معلومات و سامان بھی مہیا کرنا اور ہدف کو حاصل کرنے کے ممکنہ طریقوں کی جانب کچھ اشارہ کرنا۔ اس کے علاوہ آموزشی مقاصد ٹولی کے طلبہ کو واضح کرنا اور آپسی تعاون سے اس کے حصول کے لیے ہر طالب علم کو انفرادی اور ٹولی کے ممبر کی حیثیت سے ذمّے دار بنانا۔

4. گروپ کو کام کرنے کے مواقع فراہم کرنا اور اس کے صحیح سمت میں آگے بڑھنے کو یقینی بنانا:

ہر ایک ٹولی کو اس کا کام سپرد کرنے کے بعد ٹولی کے ممبران کے درمیان کاموں کی تقسیم کرنا۔ مثلاً اگر کسی درجے میں تہوار کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا کام کسی ٹولی کو سپرد کیا گیا ہے تو اس کام کو پورا کرنے کے لیے الگ الگ ذمے داری دینی ہوگی۔ مثلاً کوئی مختلف کتابوں سے معلومات جمع کرے گا تو کوئی مختلف تہواروں کی تصاویر جمع کرے گا۔ کوئی سماج کے الگ الگ لوگوں سے مزید معلومات حاصل کرے گا۔ پھر ان معلومات و تصاویر کا ٹولی کے ممبران آپس میں تبادلہ کریں گے۔ پھر آپس میں تبادلۂ خیال اور بحث و مباحثہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچیں گے۔ اس آپسی تفاعل (Interaction) کے دوران استاد کو یہ خیال رکھنا ہوگا کہ سبھی طلبہ کو مساوی مواقع ملیں اور پوری ٹولی میں ایک ٹیم کا جذبہ (Team Spirit) شروع سے آخر تک قائم رہے۔ اس کے لیے انھیں بین الشخصی مہارتوں (Interpersonals kills)، مثلاً قائدانہ صلاحیت، ایک دوسرے پر اعتماد، تصفیہ و انتظام تضاد، تعمیری تنقید، مصالحت، حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر استاد گروہی کام (Group Work) کے دوران ان مہارتوں میں کمی محسوس کرتا ہے تو انھیں پیدا کرنے کے لیے اس کی جانب سے پہل درکار ہوگی۔ استاد کو ٹولی کے کام میں مشغول ہونے (Group Work) کے دوران یہ بھی نظر رکھنی ہوگی کہ ٹولی کا کوئی ممبر دوسروں پر اپنی برتری نہ دکھانے لگے اور سب کو کام کرنے اور اپنی بات رکھنے کے یکساں مواقع مل پائیں۔

5. امداد باہمی کے ذریعے آموزشی مقاصد تمام طلبہ کے لیے قابل حصول بنانا:

آموزش بذریعہ امداد باہمی کے طریقے کو اپنانے کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ آموزشی مقاصد کا حصول تمام طلبہ کے لیے یقینی بنایا جائے۔ اس لیے طلبہ کے گروپ میں کام کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا لازمی ہوتا ہے کہ محض ذہین طلبہ ہی نہیں بلکہ تمام طلبہ کے آپسی اشتراک و تعاون سے آموزش کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کام کے دوران ہر طالب علم کو سوال کرنے اور اپنے شکوک و شبہات دور کرنے کا بھرپور موقع مل سکے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ٹولی کے تمام افراد دوسرے کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے کوشاں ہوں۔ اس طرح نہ صرف گروپ کے لیے تجویز کردہ کام بحسن و خوبی اپنے انجام تک پہنچے گا بلکہ آپسی تعاون و اشتراک سے ہر طالب علم کو بامعنی آموزش کروانا بھی یقینی ہو جائے گا۔ کام مکمل ہونے کے بعد اس کی تفصیلی رپورٹ درجے کے بقیہ طلبہ کے سامنے پیش کرنا بھی آموزش بذریعہ امداد باہمی کا ایک اہم جز ہے۔ رپورٹ پیش کرنے سے جماعت میں سبھی ٹولیوں کے تجربات اور مسائل کے حل سے متعلق مختلف معلومات اکٹھا ہو جاتی ہیں جو مواد مضمون کو زیادہ حقیقی انداز میں سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں ایک روایتی طریقہ اپنانے والے کلاس روم اور آموزش بذریعہ امداد باہمی کے طریقے پر عمل کرنے والے کلاس روم کے درمیان مندرجۂ ذیل نکات کی بنیاد پر فرق کیا جا سکتا ہے۔

روایتی طریقے اپنانے والا کلاس روم	آموزش بذریعہ امداد باہمی پر عمل کرنے والا کلاس روم
طلبہ اپنا اپنا کام انفرادی طور پر کرتے ہیں۔	ایک دوسرے کے تعاون سے، ٹولی میں کام کرتے ہیں تاکہ آموزش ہو سکے۔
طلبہ کی نظر سامنے کی جانب ہوتی ہے اور وہ خاموش ہوتے ہیں۔	ایک دوسرے سے نظریں ملا کر اور شانہ سے شانہ ملا کر کام میں مشغول ہوتے ہیں۔
صرف اپنے استاد کی بات غور سے سنتے ہیں۔	اپنی ٹولی میں موجود سبھی ممبران کی بات غور سے سنتے ہیں۔
آموزش کا ذریعہ صرف استاد اور تدریسی سازوسامان و کتب ہوتے ہیں۔	طلبہ ٹولی میں موجود اپنے ہمسروں سے سیکھتے ہیں۔
خاموشی نہایت پسندیدہ عمل تصور کیا جاتا ہے۔	تعمیری گفتگو و کام پسندیدہ عمل تصور کیے جاتے ہیں۔
فیصلے کا اختیار صرف استاد کو حاصل ہوتا ہے۔	ٹولی میں طلبہ فیصلہ کرنے میں خود مختار ہوتے ہیں۔
طلبہ اکثر غیر متحرک سامع ہوتے ہیں۔	طلبہ متحرک اور آموزش کے لیے سرگرم ہوتے ہیں۔

مشتاق احمد

مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی لسانی پالیسیاں اور اردو
(بہار کے خصوصی حوالے سے)

اردو نہ صرف ہندوستان اور برصغیر بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔ ہندوستان میں یہ کروڑوں لوگوں کی مادری زبان ہے جن میں تمام مذاہب کے لوگ شامل ہیں۔ آج ہندوستان میں دستور ہند کے جدول آٹھ میں شامل قومی زبانوں میں، بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے ہندی، بنگلہ، تیلگو، مراٹھی اور تمل کے بعد اردو چھٹے نمبر پر ہے۔ یہ زبان نہ صرف ہر طبقے میں مقبول رہی ہے بلکہ ہر مذہب کا ادب بھی اس میں دستیاب ہے۔ یہ زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی امین ہے۔

کسی بھی زبان کی زندگی، ترقی اور بقا کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ وہ تعلیم کا ذریعہ ہو، روزگار سے اس کا رشتہ قائم ہو اور روزمرہ کے کاروبار اور دفتروں میں اس کا چلن عام ہو۔ لیکن آزادی کے بعد مختلف وجوہ سے اردو زبان کے ساتھ تعصب کا رویہ اپنایا گیا اور انتظامی امور سے اردو کو دور کرنے کی سازشیں کی گئیں۔ ذریعۂ تعلیم کے زاویے سے اگر دیکھا جائے تو اردو کو سہ لسانی فارمولے میں شامل تو کرلیا گیا مگر عملاً سہ لسانی فارمولے کے تحت ایسے متبادل رکھے گئے کہ اردو کو آسانی سے بے دخل کیا جاسکے۔ بعض ریاستوں نے اسے سرکاری حیثیت تو دی لیکن اسے تعلیمی عمل اور انتظامیہ سے مربوط نہیں کیا۔

مرکزی حکومت نے ملک میں سروشکشا ابھیان کا آغاز کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ 2010 تک 6 تا 14 سال کے تمام بچوں کو ابتدائی تعلیم فراہم کی جائے گی۔ اس اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس مہم میں اقلیتوں کی تعلیم پر خصوصی زور دیا جائے گا۔ اس مد کے تحت 18 کروڑ روپے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس مہم میں مدرسوں کو مزید متحرک بنانے کی امدادی اسکیم بھی شامل کی گئی ہے اور اس کے لیے مزید فنڈ رکھے گئے ہیں۔ لیکن مرکزی حکومت کے زیر انتظام چلنے والے سینٹرل اسکول اور نو ودے ودیالیہ میں اردو تعلیم کا کہیں معقول انتظام نہیں جو بہت ہی افسوسناک ہے۔ اگر ان اسکولوں میں اردو تعلیم کا باضابطہ انتظام ہو جائے تو اردو زبان کی ترقی کا ایک نیا راستہ کھل سکتا ہے۔ مرکزی حکومت کو لسانی اقلیتوں کے اس اہم مسئلے پر توجہ دینی چاہیے اور جلد از جلد ان اسکولوں میں اردو تعلیم کو یقینی بنانا چاہیے۔

مرکزی حکومت کی لسانی پالیسی کے تحت زبانوں کی ترقی کے لیے کام کرنے والا ایک ادارہ سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، میسور ہے جو ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے فروغ کے لیے بھی کام کرتا ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی شاخیں لکھنؤ اور سولن میں خصوصی طور پر اردو زبان کی تعلیم کے سلسلے میں کام کرتی ہیں اور اس کے اچھے نتائج سامنے آرہے ہیں۔ مرکزی حکومت کی لسانی پالیسی کے تحت ہی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کئی برسوں سے اردو کے فروغ میں کلیدی رول ادا کررہی ہے۔ کونسل نہ صرف کلاسیکی ادب شائع کررہی ہے بلکہ اسکولوں اور مدرسوں کو نصابی کتب اور دیگر سہولتیں بھی فراہم کررہی ہے۔ کونسل اردو زبان کو انفارمیشن ٹیکنالوجی سے بھی ہم آہنگ کررہی ہے۔ اور اس مقصد کے لیے پورے ملک میں کمپیوٹر مہیا کرارہی ہے۔ قومی کونسل نے ملک میں کئی جگہوں پر اردو خطاطی کے مراکز قائم کیے ہیں جن میں قدیم فن خطاطی کو تجارتی آرٹ اور گرافکس سے ہم آہنگ کرکے اس فن میں روزگار کے نئے مواقع پیدا کیے جارہے ہیں۔

کسی بھی زبان کے فروغ میں اس زبان کے اخبارات و رسائل اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے انھیں ہر اعتبار سے بہتر بنانا اور جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ کرنا ضروری ہے اس سلسلے میں قومی اردو کونسل نے ملک کے 45 اخباروں کو یو۔این۔آئی کی ٹیلی پرنٹر سروس مہیا کرا کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔

آئین ہند کی 86 ویں ترمیم کے مطابق چودہ سال تک کے ان تمام بچوں کو جن کی مادری زبان اردو ہے مفت اور لازمی تعلیم اردو میں دی جائے گی۔ 14 برس تک کی یہ تعلیم لازماً اسکول کے نظام کے ذریعے دی جاتی ہے۔ سرکاری اسکولوں کی نظم وضبط کی کمی نے اوپن اسکول جیسے نظام کو جنم دیا ہے۔ اس اسکول کے ذریعے بھی اردو کی تعلیم کو عام کیا جاسکتا ہے جس سے اردو زبان کے فروغ میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

مرکزی حکومت کی لسانی پالیسی کے تحت فروغ اردو کے لیے این.سی.ای.آر.ٹی، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکادمی، انڈین کونسل فار میڈیکل ریسرچ (یونانی) اور مولانا آزاد نیشنل اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد جیسے ادارے کام کررہے ہیں۔ ان اداروں کو مرکزی حکومت کروڑوں میں فنڈ دیتی ہے۔

اگر اردو کی بقا اور ترقی کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا جائے تو اردو زبان کی ترقی کا راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔ مولانا آزاد یونیورسٹی، حیدر آباد نے بہت کم عرصے میں اردو کے فروغ کے لیے نمایاں کام انجام دیے ہیں اور اس کا دائرۂ کار روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے جو اردو کے لیے ایک نیک شگون ہے۔

مرکزی حکومت اپنی لسانی پالیسی کے تحت سرکاری محکموں اور ایجنسیوں کے علاوہ نیم سرکاری اداروں اور رضا کار تنظیموں کو بھی فنڈ مہیا کراتی ہے۔ اس فنڈ کا صحیح استعمال خود اردو والوں کی ذمے داری ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، غالب اکادمی دہلی، اقبال اکادمی بھوپال، ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد اور ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ ایسی تنظیمیں ہیں جن کی طرف اردو والے بڑی امید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس سال کے بجٹ میں حکومت نے اقلیتوں کی تعلیم بالخصوص اردو زبان کے فروغ کے لیے خصوصی فنڈ کا اہتمام کیا ہے۔ اگر واقعی اس فنڈ کا استعمال اردو کے کاز کے لیے کیا گیا تو ممکن ہے کہ اردو زبان کے فروغ کا کوئی نیا راستہ بھی کھل سکے۔

ریاست بہار میں اردو کی صورت حال بعض دیگر ہندی علاقے والی ریاستوں سے قدرے بہتر ضرور ہے لیکن بہار میں گذشتہ دو دہائیوں میں تعلیمی میدان میں جس طرح کی گراوٹ آئی ہے اس سے اردو تعلیم کو بہت زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ بہار میں 1980 میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور اسی سال حکومتِ بہار نے ایسے تمام اعلیٰ ثانوی اسکول جو عوام کے زیر انتظام تھے اپنی تحویل میں لے لیے۔ اسکولوں کی دیکھ ریکھ کلی طور پر حکومت کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ان اسکولوں میں اساتذہ کی بحالی، ان کے تبادلے، تنخواہ کی ادائیگی غرض سارے کام حکومت کرنے لگی۔ حکومت کے ان اقدامات سے ان اسکولوں کے اساتذہ اور دیگر ملازمین کو اقتصادی فائدہ تو ضرور ہوا لیکن ایک تلخ سچائی یہ بھی ہے کہ تعلیم کے معیار میں دن بہ دن گراوٹ آتی گئی۔ سیاسی چپقلش سے یہ تعلیمی ادارے متاثر ہوتے رہے۔ ابتدائی اسکولوں کے اساتذہ سال میں چھ مہینے تدریس کی بجائے دیگر سرکاری کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ اس کے اثرات دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی تعلیم پر بھی پڑے ہیں۔ بہار میں تین طرح کے تعلیمی ادارے ہیں۔

1. سرکاری تعلیمی ادارے (ابتدائی تا یونیورسٹی)
2. غیر سرکاری تعلیمی ادارے (پرائمری تا بارھویں)
3. دینی تعلیمی ادارے یعنی مدارس اور سنسکرت پاٹھ شالائیں (بنیادی تا فاضل و آچاریہ)

ریاست بہار میں کل 37075 پرائمری اسکول بشمول اردو مکتب ہیں۔ ان پرائمری اسکولوں میں 75 فیصد ایسے اسکول ہیں جہاں ایک یا دو اساتذہ ہی موجود ہیں۔ بقیہ 25 فیصد اسکولوں میں بھی اردو اساتذہ کی کمی ہے۔ اس طرح پرائمری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی کمی نے اردو زبان کی تعلیم کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو، بہار اس مسئلے کے حل کے لیے اکثر آواز بلند کرتی رہی ہے لیکن حکومت ہنوز یقین دہانیوں کے سوا کچھ نہیں کر سکی۔

بہار میں مڈل اسکولوں کی تعداد 9772 ہے۔ ان میں بہت اسکول ایسے بھی ہیں جن میں اردو اساتذہ نہیں ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ گذشتہ پندرہ برسوں میں اردو اساتذہ کی بحالی نہیں ہوئی۔ ہاں! کسی دوسرے مضمون کے اساتذہ جو اردو جانتے ہیں وہ کہیں کہیں اردو بھی پڑھا رہے ہیں لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ حکومت نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ اردو کے 15000 اساتذہ بحال کیے جائیں گے لیکن اب تک اس اعلان پر عمل نہیں ہوا ہے۔

بہار میں کل 2971 (اعلیٰ ثانوی) اسکول ہیں۔ اعلیٰ ثانوی سطح پر اردو اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ یہاں بھی اساتذہ کی کمی کا رونا ہے۔ دس ہزار اساتذہ کی جگہیں اور 1500 ہیڈ ماسٹر کے عہدے برسوں سے خالی پڑے ہیں۔ 1800 اسکولوں میں اردو یونٹ پر دوسرے مضامین کے اساتذہ کام کر رہے ہیں جس کا اردو تعلیم پر منفی اثر پڑ رہا ہے۔

بہار میں 450 پروجیکٹ ہائر سکنڈری اسکول ہیں جن میں صرف لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ان میں 230 اسکول ایسے ہیں جن میں اردو کی پوسٹ ہی نہیں ہے لہٰذا وہاں اردو کی تعلیم کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ 150 پروجیکٹ اسکول 82-1981 میں قائم ہوئے تھے جبکہ 300 اسکول 85-1984 میں حکومت نے منظور کیے۔ لیکن آج تک حکومت نے ان اسکولوں میں اردو اساتذہ کی بحالی کا کوئی انتظام نہیں کیا، جہاں اردو کی اسامیاں نہیں ہیں یا خالی ہیں۔ البتہ بہار کے 74 اقلیتی اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں 40 ایسے اسکول ہیں جہاں اردو کی تعلیم کا معقول انتظام ہے۔

اردو کی تعلیم کو 1986 کی نئی تعلیمی پالیسی نے بھی متاثر کیا ہے۔ اس نئی قومی تعلیمی پالیسی کے تحت پرائیویٹ اسکول کھولنے کے راستے ہموار ہوئے۔ ریاستی حکومت نے کھلے دل کے ساتھ No Objection Certificate دینے شروع کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی گلی گلی میں پرائیویٹ اسکول کھل گئے۔ ان اسکولوں میں تعلیم کو تجارت کے طور پر اپنایا گیا۔ ان میں اردو تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا۔ ان انگریزی اسکولوں میں اپنے بچوں کو پڑھانے والے والدین بھی اردو کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ اگر ان سے اردو کے بارے میں پوچھیے تو کہیں گے کہ "اتنا چھوٹا بچہ ہے کتنی زبانیں پڑھے۔ بعد میں دیکھا جائے گا" اور یہ "بعد" کبھی نہیں آتا۔ آج انگریزی ذریعۂ تعلیم والے اسکولوں سے فارغ ہونے والے 80 فیصد طلبہ اردو سے

ناواقف ہیں۔ یونیورسٹی اور کالج کی سطح پر بھی صورت حال کچھ بہتر نہیں ہے۔

بہار میں ایک سنسکرت یونیورسٹی کے علاوہ گیارہ یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی پٹنہ کا قیام 1994 میں عمل میں آیا لیکن اب تک یہ محض کاغذ پر ہی ہے۔ بقیہ دس یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے لیکن ان یونیورسٹیوں سے ملحق کالجوں میں تقریباً 175 ایسے کالج ہیں جن میں اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ کسی کالج میں اردو کی پوسٹ ہے لیکن برسوں سے لکچرر نہیں ہیں اور کہیں اردو کی پوسٹ ہی نہیں ہے۔

بہار میں اردو تعلیم کے فروغ میں دینی مدارس کا اہم رول ہے۔ یہاں 1119 سرکاری مدارس، 2600 حکومت سے منظور شدہ مدارس اور 3000 خود کفیل مدارس ہیں۔ ان تمام مدارس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ ان مدارس کے نصاب کی تمام کتابیں ابتدائی تا فاضل اردو میں ہیں اور تمام مضامین اردو میں ہی پڑھائے جاتے ہیں۔

قومی تعلیمی مشن کے تحت بہار میں بھی قومی خواندگی مشن، تعلیم بالغاں غیر روایتی تعلیم جیسے منصوبے چل رہے ہیں۔ تعلیم بالغاں اور قومی خواندگی مہم میں مادری زبان کی بڑی اہمیت ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ جہاں جہاں یہ منصوبے چل رہے ہیں وہاں اردو علاقوں میں اردو کی کتابیں مہیا کرائی جا رہی ہیں اور بڑی تعداد میں لوگ اس کے ذریعے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اردو کے لیے کام کرنے والی رضا کار تنظیموں کو اس مہم میں شامل ہو کر کوشش کرنی چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ افراد اردو لکھنا پڑھنا سیکھ سکیں۔

ریاستی سطح پر فروغ اردو کے لیے مشاورتی بورڈ، کمیشن اور اردو اکادمیاں بھی قائم کی گئی ہیں۔ اردو اکادمیوں نے اردو آبادی کے بڑے حلقے کو یہ تاثر دیا کہ حکومت اس طور پر اردو زبان کے فروغ کے لیے ٹھوس قدم اٹھانا چاہتی ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ اردو اکادمیوں کے لیے جو پالیسیاں وضع کی گئی ہیں وہ محض ادب کے فروغ اور ثقافت کے تحفظ میں معاون ہیں، زبان کے لیے نہیں۔ اردو اکادمیوں کی اکتوبر 2000 کی جے پور کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اردو آبادی میں ناخواندگی کو دور کرنے کے لیے ریاستی اکادمیاں خصوصی اقدامات اٹھائیں گی اور تمام اکادمیوں کو قومی خواندگی مہم کا حصہ بنایا جائے گا۔ لیکن میری معلومات کے مطابق دہلی اردو اکادمی کو چھوڑ کر اب تک کسی ریاستی اکادمی نے اس فیصلے کی روشنی میں کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔

مرکزی حکومت اور بعض ریاستی حکومتوں نے بھی اردو کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ خود اردو والے اس زبان کی ترویج کے لیے آگے آئیں اور عملی طور پر اس میں شامل ہوں۔

پرواز

مصنف: ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام بہ تعاون ارون تیواری

مترجم: حبیب الرحمٰن چغتائی

ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام ایک ماہی گیر کے گھر پیدا ہوئے اور اپنی محنت، لگن اور خود اعتمادی کی بدولت صدر جمہوریہ کے باوقار عہدے تک پہنچے ہیں۔ صدر جمہوریہ کے اعلا منصب پر فائز ہونے سے قبل اگنی، پرتھوی، آکاش، ترشول اور ناگ جیسے میزائلوں کی تیاری، ملک کی سائنسی اور دفاعی پیش رفت اور ہندستان کو ایک نیوکلیائی طاقت بنانے میں ان کا جو کردار رہا ہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہ خودنوشت خود اعتمادی کے پیکر ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام کی داستانِ حیات کے ساتھ ساتھ ملک کی سائنسی ترقی کی داستان بھی ہے۔

صفحات: 201، قیمت-/177 روپے

مرزا غالب: ایک سوانحی منظرنامہ

مصنف: گلزار

اردو میں منظرنامہ ایک نئی صنفِ ادب ہے جو فلم کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ بصری پیکروں کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو کہانی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ غالب کی حیات و شخصیت پر گلزار کے شاہکار سیریل ''مرزا غالب'' کا یہ منظرنامہ ایک تاریخی دستاویز ہے جس سے نہ صرف غالب کی حد درجہ دلچسپ، پیچیدہ اور پہلودار شخصیت کی کئی پرتیں یکے بعد دیگرے کھلتی جاتی ہیں بلکہ عہد غالب کی تہذیب و ثقافت بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ منعکس ہوتی ہے۔

صفحات: 236، قیمت-/395 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فیروز بخت احمد

ادبِ اطفال اور ہماری بے حسی

بڑوں کے ادب سے کہیں زیادہ بچوں کے ادب کی اہمیت ہے۔ مگر افسوس کہ عہد حاضر میں اردو داں طبقہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ آج اردو میں بچوں کے لیے نہ تو کہانیوں کی کتابیں لکھی جا رہی ہیں اور نہ ان کے لیے اچھے رسائل دستیاب ہیں۔ ہنوز اس جانب کوئی توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔

جب شفیع الدین نیر، سراج انور، کرشن چندر، رام لعل، جیلانی بانو، ہاجرہ مسرور، راجہ مہدی علی خاں، احمد جمال پاشا، احمد وصی، غیاث احمد گدی، شکیل انوار صدیقی، کیف احمد صدیقی، ایم یوسف انصاری ''بابا میاں''، عبد الغفار مدھولی، عبدالواحد سندھی، محوی صدیقی، رضیہ سجاد ظہیر، الیاس دہلوی، حسین حسان ندوی وغیرہ بچوں کا بہترین و اعلیٰ ترین ادب تحریر کیا کرتے تھے۔ اس معیار کا ادب اب دیکھنے کو نہیں ملتا۔ آج تو ہمارے اپنے گھروں کے بچے بھی اردو سے نابلد ہیں جو ''پھل'' کو تو ''فل'' کہتے ہیں مگر ''فیروز'' کو ''پھروج'' بولتے ہیں، ''پھر'' کو ''فر'' بولتے ہیں اور ''جلیل'' کو ''ذلیل'' پڑھتے ہیں۔ ''کبوتر'' کو ''کھوتر'' بولتے ہیں اور ''قمیض'' کو ''کمیج'' کہتے ہیں۔ یہ دراصل بچوں سے زیادہ ہماری یعنی والدین کی لاعلمی کا پتہ دیتا ہے۔ اردو بڑی میٹھی زبان ہے۔ یہ زبان ہمیشہ زندہ رہے گی کیونکہ ہر دور میں اس کو زندہ رکھنے والے اور اس پر مر مٹنے والے ہمیشہ رہے ہیں اور رہیں گے۔

اردو میں کچھ نہ کچھ کام بچوں کے ادب پر آج بھی ہو رہا ہے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ آج بھی ماہنامہ ''پیامِ تعلیم'' بڑی پابندی سے نکال رہا ہے۔ مکتبہ الحسنات، رامپور (یوپی) کی جانب سے بھی ماہنامہ ''نور'' بڑی مستعدی کے ساتھ طبع کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح دہلی اردو اکیڈمی کی جانب سے ماہنامہ ''اُمنگ'' ہر ماہ آ رہا ہے۔ یہ تمام رسالے اس معیار کے تو نہیں ہیں جیسے ماہنامہ ''کھلونا'' (دہلی) ماہنامہ ''ثانی'' (لکھنؤ) یا ماہنامہ ''چندا نگری'' (مرادآباد) ہوا کرتے تھے یا ماہنامہ ''پیامِ تعلیم'' اب سے پچیس سال قبل ہوا کرتا تھا۔ مگر یہ رسالے ہاں بچوں کی تھوڑی تشنگی تو ضرور کم کرتے ہوں گے۔ کھلونا بک ڈپو نے جو کام کر دکھایا، شاید اب وہ کام نہیں ہو سکتا۔ آج بھی اس دور کے اردو قارئین کو وہ خوبصورت ٹائٹلوں والی، موتیوں جیسی کتابت والی کتابیں یاد ہیں: ''شریر لڑکا'' ''پریوں کی شہزادی'' ''مانو کے کارنامے'' وغیرہ۔ یہ کتابیں کثرت سے چھپتی تھیں اور پڑھی بھی جاتی تھیں۔ پہلے ہر گلی، محلہ میں لائبریریاں ہوا کرتی تھیں جو کرائے پر کتابیں دیا کرتی تھیں۔ یہ کتابیں اتنی مقبول تھیں کہ اگر دو بچے دو مختلف کتابیں ایک آنہ یا دس پیسہ روز کے کرائے پر لاتے تھے تو آدھے دن کے بعد وہ انھیں بدل کر پڑھ لیتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ عہدِ طفلی کی سنہری یادوں کا تجربہ ہی الگ ہوتا ہے اور اس دور کی اہمیت اس وجہ سے بھی بے حد معنی رکھتی ہے کہ بچے کے دماغ کی نشو و نما، زندگی بسر کرنے کے بہت سے اصول اور سوچ اسی دور میں پروان چڑھتے ہیں اور بچپن میں بچہ جن باتوں کو ذہن نشیں کر لیتا ہے، وہ تمام عمر اس کے ساتھ چلتی ہیں۔ ادبِ اطفال کا مطالعہ بچوں کو تربیت بھی فراہم کرتا ہے۔ ادبِ اطفال کے حوالے سے چلڈرن بک ٹرسٹ اپنے یوم قیام یعنی 7 رمئی 1987 سے تا دمِ تحریر بڑا اچھا کام کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر سرکاری اداروں میں پبلی کیشنز ڈویژن ایک فعال ادارہ ثابت ہو رہا ہے۔

ادبِ اطفال کے سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے جو پیش رفت ہوئی ہے وہ بھی قابلِ ذکر ہے، اس کے ذریعے نیشنل بک ٹرسٹ کی 470 کتابوں میں سے 125 کتابیں مع ترجمہ زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ بقیہ کتابوں کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اور یکے بعد دیگرے یہ کتابیں منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ اب تک بچوں کے ادب پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کے بقول تقریباً ساڑھے اکیاون لاکھ روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ قومی کونسل کی یہ کتابیں معیاری اور سستی ہیں۔ یہ ترجمہ مختلف زبانوں سے کیا گیا ہے، ان میں کہانیاں بہت اچھی، معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔

اس کام کے لیے ان لوگوں کو آگے آنا چاہیے جو اردو سے وابستہ ہیں۔ اگر اردو کی صحیح معنوں میں وہ خدمت کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ وہ کچھ وقت نکال کر صحت مند اردو ادب بچوں کے لیے پیش کریں، یہ وقت کی اشد ترین ضرورت ہے مگر ہمارے اردو داں طبقے کا مزاج تو یہ ہے کہ تعمیری اور معیاری امور کو طاق پر رکھ کر غیر معیاری اور فضول کاموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

جب تک اردو کے یہ ٹھیکیدار اردو کے تئیں مخلص نہیں ہوں گے، اردو ترقی کے راستے پر گامزن نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اردو کی جڑوں کو سیراب کرنے کے لیے عمدہ اور معیاری ادبِ اطفال کی ضرورت ہے۔

(بہ شکریہ ''قومی آواز'' دہلی، 5 رجولائی 2005)

□□□

سلیمان اطہر جاوید

جدہ میں اردو شعر وادب کی محفلیں

جدہ میں اردو کا چلن کہاں نہیں ہے؟ شرفیہ، عزیزیہ، جامعہ، مکہ روڈ، کیلو تھری، کیلو سیون اور ایسے ہی کئی علاقوں میں تو اردو ہی یہاں کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ ان علاقوں میں دیواروں وغیرہ پر اردو ہی میں پوسٹر ملیں گے۔ خواہ حج وغیرہ کے بارے میں ہو یا حیدرآباد کی نئی بستیوں میں، مکانات، فلیٹ اور زمین کے قطعات کے تعلق سے۔ ایک بات عرض کردوں کہ یہ صرف جدہ کی حد تک نہیں ہے، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، منیٰ، عرفات اور مزدلفہ وغیرہ میں بھی دکانات کے نام اور اشتہارات کے علاوہ حرم اور مسجد نبویؐ کے آس پاس زائرین اور دیگر کے لیے ہدایات اردو میں عام ہیں۔ مثلاً دواخانہ، کرایہ ہاتھ گاڑی، مردوں کے لیے پانی پینے کی جگہ، یہ جگہ امام کے محاذی ہے۔ آگے نہ بڑھیے ورنہ آپ کی نماز باطل ہوجائے گی، کام جاری ہے، داخلہ ممنوع ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یہاں اردو والے خاصی تعداد میں ہیں خواہ کسی ملک کے رہنے والے ہوں لسانی طور پر وہ اپنی مرتبت رکھتے ہیں۔ جہاں تک مدارس وغیرہ میں اردو کا تعلق ہے، جدہ میں دو بڑے اسکول ہیں انٹرنیشنل انڈین اسکول اور پاکستان انٹرنیشنل اسکول۔ پاکستان انٹرنیشنل اسکول میں تو اردو ذریعۂ تعلیم کی بھی سہولت ہے لیکن انٹرنیشنل انڈین اسکول میں اردو ایک زبان کی حیثیت سے نصاب میں شامل ہے۔ قطع نظر اس کے جدہ میں کئی انڈین اسکول ہیں جیسے الموارد، زہاب، ہالہ، الیہار، الواہا، الفیصل، البلادی، الحیات، الاعجاز، سواہا، اقان، طلال اور حرا وغیرہ۔ یہ اسکول حکومت سعودی عرب کے منظور شدہ ہیں جن میں اردو آٹھویں۔ بارھویں جماعت تک زبان کی حیثیت سے نصاب میں شامل ہے۔ ویسے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی میں بھی داخلے کی سہولتیں حاصل ہیں۔ اردو کے فروغ کے سلسلے میں روزنامہ ''اردو نیوز'' کا تذکرہ ضروری ہے۔ ہر چند کہ یہاں حیدرآباد سے ''سیاست'' اور ''منصف'' دہلی سے ''قومی آواز، ممبئی سے ''انقلاب'' اور پاکستان سے ''جنگ''، ''اخبار جہاں''، ''اردو ڈائجسٹ''، ''سیارہ'' اور ''قومی ڈائجسٹ'' جیسے روزنامے وغیرہ آتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر تو لوگ اسی روز جو بھی مل جائے مطالعہ کرلیتے ہیں۔ لیکن اخبارات بالعموم تیسرے روز یہاں پہنچتے ہیں جو اپنے قارئین کا ایک قابل لحاظ حلقہ رکھتے ہیں۔ ''اردو نیوز'' 4رمئی 1994 سے شائع ہورہا ہے۔ یہ جدہ سے شائع ہوتا ہے اور خلیج کا واحد لیکن مقبول ترین روزنامہ ہے۔ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے کہتے ہیں اب یہ دوبئی سے بھی شائع ہوگا۔ اخباری سائز کے آٹھ صفحات پر شائع ہونے والا یہ روزنامہ دو ریال میں ملتا ہے۔ برصغیر کی خبروں کو اولیت دیتا ہے۔ اسلامی ممالک کی خبریں بھی کافی ہوتی ہیں اور ہر جمعہ کو خصوصی میگزین شائع کرتا ہے۔ ایک دوست کا اندازہ ہے کہ اس کی روزانہ اشاعت پچاس ہزار سے زیادہ ہوگی۔ اسی دوست کے مطابق عربی کے بعض روزناموں کی اشاعت ''اردو نیوز'' سے کم ہے۔ ''اردو نیوز'' کی طرح ''ملیالم نیوز'' بھی شائع ہوتا ہے۔ ملیالم بولنے والوں کی تعداد یہاں سے بھی بہت زیادہ۔ جدہ میں ان دنوں اردو کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیاں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ 1975 تک یہاں کچھ ایسی سرگرمیاں نہیں تھیں، جو بھی چہل پہل ہوتی وہ چند ایک احباب تک محدود تھی اور اپنے اپنے گھروں میں۔ 78-1977 کی بات ہے کہ یہاں امریکن اسکول جدہ میں پہلا مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں دیگر شاعروں کے علاوہ معین احسن جذبی، کلیم عاجز، بیکل اتساہی اور شمیم جے پوری نے شرکت کی اور پھر جب 1987 میں بیکل اتساہی اور ملک زادہ منظور احمد عمرہ کی ادائیگی کے لیے آئے اور ان کی آمد کی اطلاع اردو دوستوں کو ملی تو پھر کیا تھا، ناشتہ، ظہرانہ اور عشائیہ پر روزانہ تین تین شعری نشستوں کا انعقاد عمل میں آیا اسی موقع پر ''جشن خمار'' کی یادگار تقریب بھی عمل میں آئی۔

اگرچہ ریاض میں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ لیکن جدہ میں بھی اردو دوستوں، صاحبانِ ذوق اور اہلِ قلم کی اتنی تعداد ہے کہ دھیرے دھیرے کئی انجمنوں کا قیام بھی ہوتا گیا اور اب تو یہاں خاصی انجمنیں مل جائیں گی۔ ان میں بزم عثمانیہ جدہ، انڈین کلچرل سوسائٹی، مسلم ایجوکیشن سوسائٹی، اردو اکادمی، خاک طیبہ ٹرسٹ، دکن سوشیل اینڈ ویلفیر فورم، طلبائے قدیم جامعہ نظامیہ، انڈیا فورم، حلقہ ارباب ذوق، انڈین ریڈرس فورم، زندہ دلانِ جدہ، بزم اردو جدہ، عارف قریشی بزم عثمانیہ اور انڈین کلچرل سوسائٹی کے کرتا دھرتا ہیں۔ اردو کے ادبی اور تہذیبی افق کو منور رکھنے میں ان کا بھی حصہ ہے۔ بزم عثمانیہ کا 21رنومبر 1988 کو قیام عمل میں آیا۔ 1992 میں بزم عثمانیہ کی جانب سے اپنی نوعیت کا کل ہند مترنم مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ آزادیِ ہند کی گولڈن جوبلی تقاریب کے موقع پر منعقد مشاعرے کی دلنوازیاں آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہیں۔ اس مشاعرے میں بیکل اتساہی، ثقلین حیدر، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، پاپولر میرٹھی اور نواز دیوبندی جیسے معروف شاعروں نے شرکت کی تھی۔ اس بزم کی دیگر سرگرمیوں میں قابلِ ذکر حیدرآباد کے چارسوسالہ جشن کا انعقاد ہے۔ پہلی بار یہ تقاریب انٹرنیشنل انڈین اسکول میں منعقد کی گئیں۔ دوسری بار 15اور 16رجنوری 1992 کو دوروزہ جشن منایا گیا جس کی صدارت کل ہند مجلس اتحاد المسلمین کے صدر جناب صلاح الدین اویسی نے فرمائی۔ اس بزم

نے جامعہ عثمانیہ کی پلاٹینم جوبلی تقاریب کا بھی اہتمام کیا، پہلی تقریب 24 ستمبر 1993 کو اور دوسری تقریب 4 نومبر 1993 کو منعقد کی گئی۔ تیسری تقریب کا 16 دسمبر 1994 کو اہتمام کیا گیا جس میں جدہ میں حکومت ہند کے قونصل جنرل محمد فیاض الدین فاروقی نے شرکت فرمائی۔ بزم کا اپنا اشاعتی پروگرام بھی ہے۔ تین سوونیر 1992، 1997، 2002 میں شائع کیے گئے جن سے جدہ میں اردو سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی پلاٹینم جوبلی کے موقع پر جاری کردہ سوونیر میں جامعہ عثمانیہ کے بارے میں کئی وقیع اور معلوماتی مضامین ہیں۔ لکھنے والوں میں عارف قریشی پروفیسر ملا ریڈی، سعید محسن، سید عبدالمنان، سید ابراہیم، ڈاکٹر محمد عبدالخالق، ڈاکٹر سی نارائن ریڈی، فرید الوحیدی، طارق غازی، ضیاء الدین نیر اور محمد باقر کے علاوہ کئی شاعروں کی تخلیقات بھی ہیں۔ 2002 میں جاری کردہ سوونیر جشن آزادی ہند نمبر ہے۔ سطور بالا میں جن شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ جن شاعروں کو یہاں مدعو کیا گیا ان میں طالب خوندمیری، راحت اندوری، وسیم بریلوی، زبیر رضوی، منظر بھوپالی، جوہر کانپوری، ترنم کانپوری، ساغر خیامی اور طیب پاشا قادری وغیرہ شامل ہیں۔ الحاج مرزا شکور بیگ بزم عثمانیہ کی دعوت پر تقریباً ہر سال جدہ آتے رہے۔ خود جدہ میں شاعروں کی خاصی تعداد ہے۔ یہ لوگ یہاں کے ہوں یا باہر سے آئے ہوئے ہوں اتنے زمانے سے یہاں مقیم ہیں کہ خود کو جدہ کا شاعر کہلانا پسند کرتے ہیں۔ ایسے شاعروں میں چند کے نام ہیں: عبداللہ عباس ندوی، احمد جمال صادق، حسن المسعودی، فضل الرحمٰن رومی، امجد حسین امجد، صبا حسنی، نعیم حامد علی خاں، ظفر مہدی، سجاد بابر، راشد صدیقی، نعیم بازید پوری، یاد صدیقی، شجاعت علی راہی، ناظر قدوائی، طارق غازی، ارشد غازی، رشید الدین رشید، علیم خاں فلکی اور رفیع الدین ناصر۔ بعض کے تو شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ نعیم حامد علی کا ''پیکر نغمہ'' اور تسلیم الٰہی زلفی کے دو تین شعری مجموعے۔ جدہ میں صرف شاعری کے پرستار ہی نہیں شستہ علمی اور ادبی نثر کا ذوق رکھنے والے بھی ہیں۔ نثری محفلیں بھی یہاں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی آمد پر یہاں ان کے اعزاز میں تقریب منعقد کی گئی نیز پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر افضل محمد، جناب محبوب حسین جگر، جناب زاہد علی خاں اور پروفیسر حبیب ضیاء کے لیے استقبالیہ تقاریب یادگار ہیں۔ شریف اسلم صاحب بھی یہاں کی ادبی اور تہذیبی زندگی میں سرگرم حصہ ادا کرتے ہیں۔ زندہ دلانِ جدہ، انڈین ریڈرس فورم اور بزم اردو اور ایڈیاس کے ذمے داروں میں ہیں۔ زندہ دلانِ جدہ کی جانب سے منعقد مزاحیہ مشاعرہ آج بھی لوگوں کے ذہن میں تابندہ ہے۔ اردو اکادمی جدہ کے سربراہ سید جمال اللہ قادری ہیں۔ یہ اکادمی 1998 سے سرگرم عمل ہے۔ ہر چند کہ 2001 سے مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں یوم قومی تعلیم منایا جاتا ہے اور کلدیپ نیر جیسے دانشور یہاں آچکے ہیں۔ لیکن اکادمی ہلکے پھلکے طنز و مزاح کے تفریحی پروگرام سہ ماہی مقرر کیے جاتے ہیں۔ اکادمی نے تا حال دو سوونیر، یوم قومی تعلیم کے موقع پر شائع کیے ہیں، 2001 اور 2002 میں۔ جن میں مولانا آزاد کے بارے میں نامور اہلِ قلم کی تحریریں شامل ہیں، جیسے مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر رشید الدین خاں اور ڈاکٹر عصمت جاوید کے علاوہ مقامی قلمکاروں میں طارق غازی اور ابوسلمان شاہجہانپوری وغیرہ۔ اعتماد صدیقی مرحوم نے یہاں حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام عمل میں لایا تھا۔ وہ جب تک یہاں رہے شستہ اور معیاری محفلوں کا انعقاد عمل میں آتا رہا۔ آج بھی لوگ انھیں یاد کرتے ہیں۔ مصلح الدین سعدی مرحوم کی علمی اور ادبی شخصیت کی مہک بھی باذوق حضرات کے مشام جاں کو معطر کیے ہوئے ہے۔ رؤف خلش کی شخصیت اور شاعری کو پسند کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ ان کی مقبولیت اور پسندیدگی کا باعث ان کی مقبولیت اور پسندیدگی کا باعث ان کی شاعری کے علاوہ بھی بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے یہاں کسی گروہ سے وابستگی کے بغیر اپنی انفرادیت کی تشکیل کی۔ قاسم مصطفیٰ اور سیف الدین جیسے نوجوان صحافی بھی سرگرم عمل ہیں۔ جدہ ریڈیو کی اردو سروس کے لیے دو انٹرویو لینے کے موقع پر بتایا کہ اردو سروس علمی، ادبی اور شعری پروگرام خاص طور پر پیش کرتی ہے اور ان پروگراموں کے سننے اور پسند کرنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ لئیق صاحب میرٹھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جامعہ ازہر کے فارغ ہیں۔ زیادہ عرصے خلیج کے ممالک میں ''گزرا۔ شعر و ادب کا علا اور شستہ ذوق رکھتے ہیں۔ مطالعہ بھی وسیع ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہندوستانی سفارت کاروں نے بھی ان سرگرمیوں کو سراہا اور ان کی ہمت افزائی کی۔ خود شرکت کی اور جتنا ممکن ہوا تعاون دیا۔ سفرا میں جناب عشرت عزیز، جناب محمود بن محمد، جناب تمیز احمد اور جناب کمال الدین احمد کے علاوہ موجودہ قونصل جنرل ہند متعینہ جدہ جناب اکبرالدین کے خوشگوار اور ہمدردانہ تعاون کو اردو والے فراموش نہیں کر سکتے۔ ان کی وجہ سے یہاں اردو کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کے فروغ میں خاصی سہولتیں حاصل رہیں۔ یہی نہیں ہندوستانی سفارت خانہ بھی اپنے ہاں خاص طور پر یوم آزادی کے موقع پر اردو کے تہذیبی پروگراموں کا اہتمام کرتا ہے۔ جدہ میں اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور عام زندگی میں اس کے چلن میں کوئی کلام نہیں۔ اطہر ہاشمی نے بالکل درست لکھا ہے: ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پورے سعودی عرب بالخصوص جدہ میں ہندوستان و پاکستان سے تعلق رکھنے والوں میں نہ صرف اردو زبان سے رغبت بڑھ رہی ہے بلکہ ادبی ذوق بھی پیدا ہو رہا ہے۔''

......نیک تمناؤں کے ساتھ جدہ کے اردو دوستوں کو سلام!

(بشکریہ ''ہماری زبان'' دہلی، 22 تا 28 مارچ 2005)

ایم اے قریشی

سائنس، ٹیکنالوجی اور سماج

سائنسی ترقی جس تیز رفتاری سے جاری ہے اسی تیزی کے ساتھ ٹیکنالوجیکل تبدیلیاں بھی رونما ہورہی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے زیر اثر سماج کس طرح متاثر ہورہا ہے اس کے مختلف پہلوؤں کو سماج کے روبرو لانے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہے کیونکہ دنیا کے مختلف سماجوں کے لوگ مختلف نظریات سے منسلک ہیں، ان کی تہذیبی روایات بھی ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ان سماجوں میں جب کثیر تعداد میں عظیم اور انوکھے سائنسی نظریات اور خلاف توقع تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں تو ان کا ردِعمل یکساں نہیں تھا۔ ترقی پذیر ممالک میں ٹیکنالوجی کی تبدیلیوں کی پیچیدگیوں اور ان کے مقاصد کو سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا استعمال اقتصادی، سماجی اور انسانی ترقی میں اہم اور دوررس کردار ادا کررہا ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے درمیان رشتہ

سائنس کیا ہے؟ ٹیکنالوجی کیا ہے؟ اور ان دونوں کے درمیان کس طرح کا رشتہ ہے؟ سائنس کی تعریف یہ ہے کہ یہ ایک باضابطہ اور تجرباتی طریقہ ہے جس سے مظاہر قدرت کا مطالعہ کرکے ایسے نظریات وقوانین بنائے جائیں جن سے مظاہر قدرت کے رویے کی وضاحت ہوسکے۔ سائنس جذبۂ استفسار اور منطق کے طریقے سے کسی مظہر قدرت کے اسباب کی تلاش کے سلسلے کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں سب سے اہم ہے سائنسی طریقۂ کار — اس میں شامل ہیں، مشاہدہ کرنا، بہت احتیاط کے ساتھ پیمائش کرنا، مشاہدات و پیمائش کا تجزیہ کرنا، مفروضات یا نظریات وضع کرنا، عام نتیجہ اخذ کرنا اور اس کی بنیاد پر قدرتی مظاہر کی پیشین گوئی کرنا۔ یہ جاننے کے لیے کہ اختیار کیا گیا مفروضہ یا نظریہ درست ہے کہ نہیں تجربے کیے جاتے ہیں اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

ٹیکنالوجی کی تعریف ہم اس طرح کرسکتے ہیں کہ ٹیکنالوجی کسی کام کو انجام دینے کا ایک فن ہے۔ اس میں تکنیکی طریقہ اور اس کا انتظام شامل ہیں۔ تاریخی اعتبار سے انسانوں نے ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے، آلات وطریقے ایجاد کیے جن سے وہ ان چیزوں کو حاصل کرسکے جن کی ان کی زندگی اور اس کی افزائش کے لیے ضرورت تھی مثلاً شکار، جنگ، زراعت اور صنعتی پیداوار کے لیے۔ تاریخ کے شروعاتی مراحل میں ٹیکنالوجی کی بنیاد سائنسی تفہیم نہیں تھی بلکہ اس دور میں ٹیکنالوجی کا ظہور ہوا عملی، تجرباتی کوششوں اور غلطیوں سے یعنی کچھ کرنے کی کوشش سے جس میں کامیابی بھی ہوئی اور ناکامیابی بھی۔ اب منطقی طریقے سے اسباب کی تلاش کا سلسلہ اور سائنسی طریقۂ کار ختم ہوگئے ہیں۔ ہنر اور تکنیک کے شعبے کی صورت میں اس دور میں کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اب ہم ٹیکنالوجی کے حصار میں ہیں جس میں ایک ٹیکنالوجی دوسری ٹیکنالوجی سے جنم لیتی ہے۔ ٹیکنالوجی ایک آزاد ہستی کی طرح ہے۔ کئی مرتبہ دیکھا گیا ہے کہ سماج میں جہاں ٹیکنالوجی کی تبدیلی بتدریج اور شائستہ انداز میں ہوئی سماج نے اس تبدیلی کو آسانی سے قبول کیا اور اپنی تہذیب میں جذب کرلیا۔ لیکن دیگر کئی تکنیکی اختراعات جن کو سماج میں متعارف کیا جارہا ہے ان کے ساتھ ایسا نہیں ہوا کیونکہ ان کے سماج پر اثرات ٹیکنالوجی کی تدریجی تبدیلی سے کئی گنا زیادہ ہیں اور یہ بڑی تبدیلی زیادہ تر سائنس کی بنیاد پر ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ اونچے درجات کی ٹیکنالوجیکل تبدیلیاں اور ترقی صرف سائنسی طریقۂ کار کے استعمال سے ہی ہوسکتی ہیں۔ لیکن یہ سوچے بغیر کہ سائنس کے طریقۂ کار کے استعمال اور سائنسی تفہیم سے جو چیز پیدا ہوئی اس کا حتمی اثر سماج و ماحولیات پر کیا ہوگا، انسانی علم کے ذخیرے کو بڑھانے اور اس کے استعمال کے کیا کیا امکانات ہوسکتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے درمیان رشتے کے تین پہلو ہیں:

(1) آج سائنس اور ٹیکنالوجی کے درمیان ایسا رشتہ ہے جو ایک دوسرے کو بڑھاوا اور قوت دے رہا ہے۔ ٹیکنالوجی کی ترقی میں تیزی سائنسی طریقۂ کار کے استعمال سے آئی۔ اسی طرح عظیم سائنسی ترقی نئے، اعلیٰ اور مؤثر ٹیکنالوجیکل آلات کی وجہ سے ہوئی۔ یہ آلات اب بہت تیزی کے ساتھ سائنسی تحقیق کے لیے فراہم ہورہے ہیں۔

(2) یہ بات قابل توجہ ہے کہ اب ٹیکنالوجی کا تعلق صرف صنعت سے ہی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہر پیداواری میدان عمل اور ان میں حتمی استعمال سے ہے۔ زراعتی ٹیکنالوجی اور طبی ٹیکنالوجی اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ چالیس یا پچاس سال پہلے حیاتیاتی سائنس میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کی بنیاد اس میدان میں ہونے والی سائنسی ایجادات تھیں۔ اس کی وجہ سے ہی حیاتیاتی ٹیکنالوجی کا سلسلہ شروع ہوا۔

(3) ایک نیا ٹیکنالوجی کا میدان جو مستقبل میں انسانی سماج کا رخ متعین کرے گا وہ ہے انفارمیشن ٹیکنالوجی۔ اس کا تعلق ہے معلومات کی ذخیرہ اندوزی، اطلاع کی عمل کاری، منتقلی، اطلاع دہی، حصولیابی اور اطلاع کا استعمال۔ حالیہ چند برسوں میں مکمل انفارمیشن کی صنعت وجود میں آئی ہے۔ اس صنعت میں ہارڈ ویئر ہے جس میں کمپیوٹر اور اظہار و اطلاع دہی کے آلات شامل ہیں۔ اس صنعت میں سافٹ ویئر بھی ہے جس کے لیے تیزی کے ساتھ بدلتی ہوئی ٹیکنالوجی ہے۔ اس لیے ہمیں اب اس تصور سے باہر نکلنا چاہیے کہ ٹیکنالوجی کا تعلق خالص طور پر صرف ہارڈ ویئر سے ہے۔

سائنس کے اہم کارنامے

اس بات سے تو سب اچھی طرح واقف ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے استعمال سے مختلف اقتصادی و سماجی بہبود کے میدانوں میں زبردست ترقی ہوئی ہے۔ موجودہ سماج میں سائنس کے کارہائے نمایاں کی جھلک مختلف قسم کی مشینوں اور آلات میں نظر آرہی ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی شے اور تکنیک ہمیشہ اس کی تین طرح کی صلاحیتوں کا مظہر ہوتی ہیں۔

(1) تجسس انسان کی فطرت میں شامل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اردگرد کے حالات کو جاننا چاہتا ہے، سمجھنا چاہتا ہے اور اس لیے تفتیش کرتا ہے۔ (2) انسان خیالی دنیا کی تخلیق کرتا ہے، کچھ ضرورتوں کی تکمیل کے لیے خواب بُنتا ہے اور پھر ایجاد کرتا ہے۔ (3) ایجادات کو وجود میں لاتا ہے، چیزیں بناتا اور تخلیق کرتا ہے۔

صرف انسان میں ہی یہ تینوں صلاحیتیں یکجا طور پر کارفرما ہوتی ہیں۔ جدید شہری صنعتی سماج کی ترقی انسان کی ان خداداد صلاحیتوں پر ہی مبنی ہے۔ خاص طور پر سائنسی وضاحت اور پیشین گوئی جن کی وجہ سے حسب ذیل سماجی تبدیلیاں و ترقی ممکن ہوسکیں:

(1) ٹیکنالوجیکل اور سماجی تبدیلیاں تقریباً ہر انسانی عمل میں جاری ہیں، روز بروز نئی ٹیکنالوجی منظرِ عام پر آرہی ہے جس سے سماج کے مختلف شعبے متاثر ہورہے ہیں:

- ☆ بڑھتا ہوا شہری اور صنعت کاری کا نظام۔
- ☆ پیداواری اداروں کے معیاروں میں وسعت۔
- ☆ فاصلوں میں کمی ہونے کی وجہ سے تجارتی اور اقتصادی طریقہ کاروں میں تبدیلیاں۔
- ☆ نئی ٹیکنالوجی سے نئی صنعتیں پیدا ہورہی ہیں اور اس کی وجہ سے دنیا ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں بٹ گئی ہے۔
- ☆ نئے مواد کی ضرورت کے لیے تحقیقی تجربہ گاہوں پر انحصار بڑھ رہا ہے۔
- ☆ دوا، عوامی صحت، صنعت، زراعت، رسل و رسائل، انفارمیشن ٹیکنالوجی، خلائی تحقیق، توانائی وغیرہ کے میدانوں میں نئی سے نئی ٹیکنالوجی نمودار ہورہی ہے اور سماج تکنیکی انقلاب کے دہانے پر کھڑا ہے۔

سماجی منظر کی کایا پلٹ:

ٹیکنالوجی کی ترقی سے جو سماجی و تہذیبی کایا پلٹ ہوئی ہے اس کا کچھ اندازہ ذیل میں دی گئی تبدیلیوں سے لگایا جاسکتا ہے:

- ☆ ٹیکنالوجی بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کی رفتار میں اضافے کی شرح بھی بڑھ رہی ہے۔ بڑھنے کی شرح میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اب تک جتنی بھی ترقی ٹیکنالوجی کے میدان میں ہوئی ہے اس میں سے 90 فیصد ترقی پچھلے پانچ برسوں میں ہوئی ہے۔ ہر ایک ٹیکنالوجی ہماری مادّی زندگی کی شکل، سماجی قدروں اور اداروں کو، جن کے گرد ہماری زندگی گزرتی ہے، بدل رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ سماجی قدریں اور ادارے کچھ مستحکم ہوں، نئی ٹیکنالوجی پھر سماج میں داخل ہوکر ان کو مزید تبدیل کرتی ہے۔ نئی ٹیکنالوجی سماج میں لگاتار داخل ہورہی ہے اور اس طرح سماجی قدریں و ادارے بھی تبدیلی کی حالت میں رہتے ہیں۔ بالالفاظ دیگر سماج ہر دم ٹیکنالوجی کے متعارف ہونے سے ناپائیداری کی حالت میں رہتا ہے کیونکہ اس کی قدروں میں کہیں ٹھہراؤ نہیں ہے۔
- ☆ تکنیکی ایجاد دولت پیدا کرتی ہے جس کے عوض افراد کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ پھر یہ افراد اپنی مزید آمدنی کو نئی نئی اشیا، خدمات اور سہولتیں خریدنے میں صرف کرتے ہیں تاکہ زندگی میں زیادہ آرام مل سکے۔ ان میں اور کمانے کی خواہش بڑھتی ہے اور اس کے ساتھ اس آمدنی کو خرچ کرنے کی خواہش بھی افزوں ہوتی ہے، جس سے نئی ایجادات کی ضرورت پر دباؤ بڑھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئی ایجادات کی اشیا کی عمر کم ہوجاتی ہے۔ نئی اشیا جلد پرانی ہوجاتی ہیں اور دوسری اشیا بازار میں ان کی جگہ لے لیتی ہیں کیونکہ بازار میں قوت خرید ہونے سے نئی اشیا کی مانگ بڑھتی رہتی ہے۔
- ☆ زمینی سفر اور ہجرت آج کل جس قدر عام ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ سفر، رسل و رسائل اور ابلاغ کے ذرائع کا دن بدن وسیع تر ہونا ہے۔ بہت سارے ایسے پیشہ ور اور کلرد باری لوگ ہیں جو اپنے کاموں کی جگہ پر جانے کے لیے 100 سے 200 کلومیٹر روز سفر کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان

حالات میں ایک شخص کو ایک مہینے یا ایک سال میں کتنا سفر کرنا پڑتا ہے۔ ہندوستان میں ایک پیشہ ور یا کاروباری انسان کو اگر 100 کلومیٹر روز کا سفر کرنا پڑے تو اپنی کل چالیس سال کی پیشہ ورانہ زندگی میں وہ ایک لاکھ بیس ہزار کلومیٹر سفر طے کرے گا۔ اس سفر کی وجہ سے اس کی سماجی زندگی کے رشتوں کی ماہیت اور قدریں بالکل بدل جائیں گی۔ اس کے علاوہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کے مواقع سے اس کے رشتوں کی میعاد گھٹ جائے گی۔ نئی جگہوں پر جانے سے پرانے رشتے طاق نسیاں ہو جائیں گے اور نئی جگہ پر نئے رشتے بنیں گے۔

ٹیکنالوجی کا دوہرا پن

ٹیکنالوجی کوئی پُر اسرار شے نہیں ہے۔ اس بات کی دو طرح سے وضاحت ہو سکتی ہے۔ اول کچھ سائنسی مصنفین کا کہنا ہے کہ سائنس قدرت پر انسانی فتح حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ دوم کچھ لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ ٹیکنالوجی ایک ایسا آلۂ کار ہے جس کو چند بااثر لوگ دوسرے لوگوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ شاید دونوں ہی نظریات اپنی اپنی جگہ درست ہوں۔ درحقیقت ٹیکنالوجی اطلاع کا نظام ہے جس کے ذریعے انسان اور ماحول کے درمیان ربط پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ایک مخصوص سماجی زندگی اختیار کرنے کے لیے یہ ایک کلیدی عنصر ہے۔ لیکن ٹیکنالوجی کا صرف یہی ایک متعین کام نہیں ہے، ٹیکنالوجی ایک وسیع ماحول کا حصہ ہے خاص طور پر انسانی تہذیب کا یعنی ایک طرف ٹیکنالوجی تہذیب کو متاثر کرتی ہے اور دوسری طرف تہذیب ٹیکنالوجی پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ دراصل کچھ افراد ٹیکنالوجی کی تبدیلیوں کا فائدہ اٹھا کر سماج کے دوسرے لوگوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کے اس دوہرے پن کی کئی مثالیں ہمیں سماج میں مل جائیں گی۔ ریل کی ٹیکنالوجی سے فاصلوں پر فتح حاصل ہوئی اور سماج میں کایا پلٹ کا دور شروع ہوا۔ چھوٹے زراعتی ادارے صنعتی اور شہری سماج میں تبدیل ہو گئے۔ اس سے بے پناہ اقتصادی فائدہ اور ترقی کے مواقع فراہم ہوئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسی ٹیکنالوجی کو جنگ کے لیے اور عوام پر ظلم ڈھانے کے لیے بھی استعمال کیا۔ ٹیکنالوجی پر قابو حاصل کر کے کچھ لوگ اس قابل ہوئے کہ انھوں نے وہ فیصلے کیے جن سے ہزاروں زندگیوں پر نقصان دہ اثرات مرتب ہوئے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے شروعاتی تدریجی دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کو انسانی دکھوں اور تکلیفوں کے لیے مداوا اور عیش و آرام کے لیے ایک رحمت تصور کیا گیا۔ اس لیے سماج نے اس ترقی کو بغیر کسی تنقید اور اعتراض کے قبول کر لیا۔ لیکن اب سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے مثال وسعت کے بعد ہر قومی حکومت نے یہ جان لیا ہے کہ کسی بھی بڑے ٹیکنالوجی کے منصوبے کو سماج میں متعارف کرنے سے پہلے اس کے سماجی، اقتصادی، تہذیبی، مقامی اور ماحولیاتی اثرات کا اندازہ لگانے کی ضرورت ہے بلکہ زیادہ تر ترقی یافتہ ممالک میں تو کسی بھی ٹیکنالوجی کے پروجیکٹ کو نافذ کرنے کے لیے ماحولیاتی تصادم اور اس کے اثرات کا تجزیہ اوّلین شرط ہے۔

سماج کے ساتھ ٹیکنالوجی کے دوہرے رشتے کے تعلق سے ٹیکنالوجی کے تاریخی مطالعے کی بھی دو شاخیں ہیں جو ٹیکنالوجی کے داخلی اور خارجی نظریات کی حامل ہیں۔ داخلی نظریہ ٹیکنالوجی کی ابتدا اور اس کی ماہیت کے بارے میں تاریخی مطالعہ پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس خارجی نظریہ سماج کے مختلف حصوں پر ٹیکنالوجی کے اثرات کی نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن یہ دونوں نظریات قطعی طور پر ایک دوسرے سے مستثنیٰ نہیں ہیں بلکہ ان دونوں کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔ درحقیقت داخلی نظریہ رکھنے والوں کو ٹیکنالوجی کی تبدیلی میں سماجی وجوہات کو جاننا چاہیے۔ ان کو یہ دیکھنا چاہیے کہ کس طرح خیالات وتصورات، اداروں اور پالیسیوں کے نیٹ ورک، جو ٹیکنالوجی پیدا کرتے ہیں، اپنا کام انجام دیتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ پتہ لگانے سے پہلے کہ کس طرح نئی ٹیکنالوجی سماج پر اثر انداز ہوگی، ٹیکنالوجی کی تبدیلی کی ماہیت کی تفہیم نہایت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ابتدا میں ٹیکنالوجی کی حمایت کرنے والوں (امریکن اور یوروپین) کا موٹے طور پر یہ نظریہ تھا کہ ٹیکنالوجی فتح حاصل کرنے اور ان کے ملک کی ترقی کے لیے ایک اہم قوت اور آلہ ہے۔ اس لیے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ٹیکنالوجی ملک کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مددگار رہے۔ یہی لوگ اب سماج پر ٹیکنالوجی کے مضر اثرات سے بے حد فکرمند ہیں۔ خالص عملی معیار پر موجودہ ٹیکنالوجی کو داخلی نظریات کی روشنی میں دیکھنا مشکل ہے۔ اس کی وجہ سائنس کی بے پناہ پیچیدگیاں اور اس کی کارکردگی کی اعلیٰ صفات ہیں۔ جدید سائنس کی ترقی کا آغاز پندرھویں صدی سے ہوتا ہے جو اُس وقت یورپ تک محدود تھی۔ لیکن اب اس کا دائرۂ عمل اس قدر وسیع ہو چکا ہے کہ اس نے دنیا کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے خارجی نظریات ظہور میں آنے کی صرف یہ وجہ نہیں ہے کہ ان کے اثرات کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان اثرات کی سماجی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور سماج کے درمیان ایک دو شاہراہوں والی گلی ہے اس لیے دونوں داخلی و خارجی نظریات کے طریقۂ کار سے متوازن طور پر ٹیکنالوجی کے اثرات کو سمجھنا ضروری ہے۔

سماج میں جدید ٹیکنالوجی کے داخلے کے سلسلے کو صنعتی انقلاب کا نام دیا گیا ہے۔ ایک نتیجہ جو ٹیکنالوجی کی تاریخ کے مطالعے سے اخذ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جن ممالک میں اب تک صنعتی انقلاب آیا ہے اس کا طریقۂ کار یکساں نہیں تھا۔ بیشک ان میں کچھ چیزیں یکساں ہیں جیسے بھاپ کا انجن، فیکٹریوں کا نظام اور شہروں میں اضافہ لیکن جو فرق دیکھنے میں آیا ہے وہ اہم ہے۔ امریکہ اور یورپی ممالک زیادہ تر دیگر ممالک کے مقابلے جدید ٹیکنالوجی کو اپنی ضرورتوں کے مطابق استعمال کرنے اور ترقی دینے میں زیادہ کامیاب ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کامیاب ممالک نے عظیم ٹیکنالوجیوں کو سماجی طور پر اختیار کیا اور ان کو اپنی نمایاں روایات میں جذب کرلیا۔ دوسری وجہ ہے تصوراتی طور پر سائنسی اور ٹیکنالوجیکل تبدیلیوں کو پُرزور حمایت دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب سماج کو جدید ٹیکنالوجی سے متعارف کرایا گیا تو اس کو کسی رکاوٹ اور مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس کو سماج میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ لیکن ترقی پذیر ممالک میں ایسا نہیں ہوا اسی لیے وہاں ابھی تک ٹیکنالوجی لڑکھڑا رہی ہے۔

ٹیکنالوجی سے خدشات

ایک فرانسیسی فلاسفر ژاک ایلول کے مطابق ٹیکنالوجی ایک پُراسرار قوت ہے اس لیے اس پر قابو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا کہنا ہے کہ ٹیکنالوجی تہذیب کی تباہی کا باعث ہے، یہ ناقابلِ عذر اور ناگزیر طور پر انسانی وقار کے ہر پہلو کو تار تار کررہی ہے اور ہر قابلِ لحاظ قدر کو مسخ کررہی ہے۔ ایک ڈرامائی سائنسی افسانہ اس کا اختتام ہے، ایک ایسا سماج جس میں مشینوں کی حکمرانی ہوگی یقینی طور پر اس خیال کو ہم مبالغہ آمیزی کہہ سکتے ہیں مگر ایسے خیال کی وجہ ٹیکنالوجی میں پوشیدہ بے پناہ انجانی قوت کا خوف ہے۔

صنعتی انقلاب سے لے کر اب تک کئی طرح کی مثالی اور خیالی دنیاؤں کا تصور پیش کیا جاچکا ہے۔ ٹیکنالوجی کی چونکا دینے والی صلاحیتوں اور قوتوں نے انسانی تخیل کو پرواز دی اور اس کی بنیاد پر خیالی دنیاؤں کا تصور پیش کیا گیا۔ خیالی دنیا کا تصور پیش کرنے والوں میں سب سے زیادہ معروف سائنسی افسانہ نگار ایچ جی ویلز ہے۔ اس نے ایک ایسی دنیا کا تصور دیا جس کی بنیاد ٹیکنالوجی ہے۔ اس مشینی دنیا کا باشندہ حال کے علاوہ ماضی و مستقبل کی دنیا کا مشاہدہ کرسکتا ہے جس کے لیے اس نے ایک ٹائم مشین کا تصور دیا جو انسان کو ہر دور میں لے جاسکتی ہے۔ سائنس داں جے بی ایس ہیلڈین نے اپنی کتاب ''دو یادداشتوں والا آدمی'' میں کہا ہے کہ انسان کے مستقبل اور سماج دونوں معقول سائنسی علم اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر منظم ہوں گے۔ عمرانیات کے ماہر پروفیسر بی ایف اسکنر نے اپنی کتاب ''وقار اور آزادی سے باہر'' میں دنیا کا انوکھا تصور دیا ہے۔ اس دنیا کا نام اس نے 'والڈن ٹو' رکھا ہے۔ یہ ایک ٹیکنالوجیکل سماج ہے۔ اس سماج کے ہر فرد کے لیے کوئی نہ کوئی کام چھوٹا ہو یا بڑا کرنا ضروری ہے۔ دراصل اجرت کے حساب سے اس میں کوئی کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہے۔ یہ کام چاہے پڑھانے کا ہو، تحقیق کا ہو، بندوبست سے متعلق ہو، کھانا پکانے کا ہو، صفائی کا ہو، غرض کوئی بھی کام ہو فی گھنٹہ کام کے حساب سے اُجرت سب کے لیے برابر ہے۔ کام کے عوض اس ٹیکنالوجیکل سماج کا ممبر روپیہ کے بجائے گھنٹے کماتا ہے جس کے لیے اس کو کوپن ملتے ہیں۔ یہی کوپن اس دنیا کی کرنسی ہے۔ ان کوپنوں کے عوض وہ اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتا ہے اور کوپن حاصل کرنے کے لیے اس کو جو بھی کام ملے کرسکتا ہے۔ ہر ایک کے لیے صحت و تعلیم کی فراہمی سماج کی ذمّے داری ہے۔ والڈن ٹو ایک ایسا سماج ہے جہاں کام کے لیے کوئی مقابلہ نہیں ہے اور انسان بے چینی و فکر سے بالکل آزاد ہے کیونکہ یہاں پر ہر کام کی قدر یکساں ہے۔ لیکن ایسے سماج کا رُکن بنے رہنے کے لیے انسان کو موجودہ سماج کے بنائے ہوئے وقار و آزادی کے تصورات کو چھوڑنا پڑتا ہے تب ہی والڈن ٹو میں داخل ہوکر ایک پُرسکون اور ہم آہنگ زندگی اختیار کی جاسکتی ہے۔

کئی سائنسدانوں نے بڑھتی ہوئی ماحولیاتی تباہی اور سماجی عدم مساوات پر گہری فکر ظاہر کی ہے اور ایک مشورہ دیا ہے کہ عدم مرکزی ترقی کے ماڈل یعنی متبادل ٹیکنالوجی کے پروگرام کو نافذ کرنے کے بارے میں غور کیا جائے۔ متبادل ٹیکنالوجی کی تحریک اس فکر کی نمائندگی کرتی ہے جس میں موجودہ ٹیکنالوجی کا سنجیدگی سے تجزیہ ہو، جس میں ممکن متبادل موجودہ علم کی روشنی میں انسانی تناظر کے ساتھ ہو اور ایسا سماج جس کی حدود بہتر زندگی کی صفات پر مبنی ہوں۔ سماج کو ٹیکنالوجی کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے سائنس داں جے برونوسکی کا کہنا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق تمام ایسے فیصلوں کو جن کا تعلق سماج سے ہے، حکومت کے دائرۂ عمل سے باہر نکالنا ہوگا۔ سائنس کو حکومت کے دائرۂ عمل سے باہر نکالنا ہوگا۔ سائنس کو حکومت کی حمایت ضرور ملتی رہنی چاہیے لیکن سائنس سے متعلق سارے فیصلے سائنسی برادری پر چھوڑ دینے چاہئیں تاکہ سائنس کو انسانوں کے استحصال کے لیے استعمال نہ کیا جاسکے۔ اس طرح سماج اور ماحولیات سائنس و ٹیکنالوجی سے پیدا ہونے والے نقصانات سے محفوظ رہیں گے۔ یہ ایک اہم اور دور رس نتائج کا تصور ہے خاص طور پر حیاتیاتی سائنس اور جین سے متعلق انجینئرنگ کے حوالے سے جن کا اخلاقی قدروں پر بے حد اثر پڑتا ہے۔

یہ خیال پرستی، جس کی بنیاد سائنسی افسانہ نگاری ہے، مخصوص تہذیب و تمدن اور اعلیٰ درجے کے منظم سماج کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ لیکن اس سے جڑے ہوئے کئی سوالات ہیں جن کا تعلق اخلاقیات، انسانی آزادی، اقدار اور ان سے متعلق دیگر مسائل سے ہے۔ انسان دوست فلسفی ٹیکنالوجی سے پیدا ہونے والے خدشات کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ٹیکنالوجی کی قوتیں بے روک ٹوک عمل کر رہی ہیں۔ ان قوتوں پر انسانوں کا کوئی کنٹرول نہیں ہے جس سے یہ ڈر پیدا ہوتا ہے کہ کہیں پوری انسانیت ٹیکنالوجی کی اسیر نہ بن جائے۔

ٹیکنالوجی سے خدشات کے دو پہلو ہیں۔ اوّل ٹیکنالوجی کے آلات و مشین پر قابو پا کر انسانی زندگی کو گرفت میں لینے کا خدشہ ہے۔ دوم سیاسی رہنما، صنعت کار اور دیگر بااثر لوگ عوام کو ترغیب دے سکتے ہیں کہ جیسا وہ چاہتے ہیں عوام ویسا ہی کریں۔ لیکن انسان دوست دانشور اس بات سے فکر مند ہیں کہ سائنس داں اس معاملے میں بے حسی کا شکار ہیں اور وہ سائنس کے نتائج سے الگ ہو کر سوچتے ہیں۔ سائنس دانوں کی معروضیت سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح سائنس کو انسانی بہبود کے تناظر میں ترقی دی جائے۔ ان کا خیال ہے کہ سائنسی طریقۂ کار کے پھیلاؤ سے جو ترقی کے پہلو رونما ہو رہے ہیں ان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے انسانی ہمدردی کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ سائنسی علم کی افزائش بغیر کسی انسانی تناظر کے خصوصی مقاصد کے لیے استعمال کی جا رہی ہے جو خود انسان اور سماج دونوں کے لیے خطرناک ہے۔ دراصل سائنس دانوں نے سائنس کے اچھے یا برے استعمال کی ذمے داری سماج اور سیاسی رہنماؤں پر ڈال دی ہے۔ اس عرصے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے مختلف میدانوں میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے مرکزیت کو قوت ملی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے عوام کی ذاتی زندگی کے ہر شعبے میں دخل اندازی کی حوصلہ افزائی۔

عالمگیریت اور ترقی پذیر ممالک

عالمگیریت (گلوبلائزیشن) سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے کئی نئے پہلو اُبھر کر منظر عام پر آ رہے ہیں جن کا براہِ راست تعلق ترقی پذیر ممالک کی سماجی ترقی سے ہے۔ اوّل بین الاقوامی تعاون، ٹیکنالوجی کے حصول کے نیٹ ورک، ٹیکنالوجی کی اختیاری ٹیکنالوجی کی ترقی اور اس کی تجارت کے مزید مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ دوم مقامی سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ و تحفظ کی پالیسی کی نفی عالمگیریت کی بنیادی شرط ہے۔ سوم سائنس و ٹیکنالوجی کے نظام کے لیے ایسے حالات وضع کرنا جو بازار کی قوتوں کے موافق ہوں۔ اس حوالے سے سماجی مقاصد پر نظرِ ثانی کر کے ان کی دوبارہ تعریف و نشاندہی کرنی ہوگی خصوصاً اس لحاظ سے کہ کس قدر مقامی سائنس و ٹیکنالوجی کی صلاحیتوں اور خارجی صلاحیتوں کے امتزاج سے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔

عالمگیریت نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ حکومتی اور نجی ادارے مجبور ہو گئے ہیں کہ وہ سائنس کے میدان میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور مل کر بازار کا مقابلہ کریں۔ اس رشتے کا نام ٹیکنوکریسی ہے اور سائنس ٹیکنالوجی کی ترقی کو اس رشتے کے تعلق سے ٹیکنوکریٹک سائنس کہا جاتا ہے۔ اب ٹیکنوکریسی کی طرف سے یہ مانگ بڑھ رہی ہے کہ صنعت، یونیورسٹی، حکومت کے درمیان معاونت کا رشتہ مضبوط ہو، تاکہ تعلیمی اداروں کی سائنس بھی ٹیکنوکریسی کا حصہ بن جائے۔ تعلیمی ادارے جو ابھی تک بازار کی بندشوں سے آزاد تھے وہ بھی بازار میں مقابلے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ ایک مناسب اور موزوں قدم ہے مگر شرط یہ ہے کہ سماجی مقاصد سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کی بنیاد ہوں۔

عالمگیریت کے موجودہ مرحلے میں یہ سوال پوچھنا اہم ہے، کیا یہ تصور کہ سائنس و ٹیکنالوجی ایک ساتھ مل کر سماجی تبدیلی کے آلۂ کار کی حیثیت سے برقرار رہ سکتا ہے اور اسی تعلق سے کیا جمہوریت میں سائنس و ٹیکنالوجی کی حمایت حقیقی ہے یا ایک فریب؟ اس سوال کے جواب کا اندازہ لگانا مشکل ہے مگر اسی سے جڑا ہوا ایک اور سوال ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ عوامی سائنس کو موثر طور پر سرکاری اور تعلیمی اداروں کی سائنس سے ملا کر عوام کو فائدہ پہنچا کر اس کا معیارِ زندگی بلند کیا جا سکتا ہے؟ اگر اس کا جواب ہاں میں مل جائے تو عالمگیریت کے اس دور میں یہ ایک بڑا کارنامہ ہوگا۔

غیر واضح تہذیبی تغیرات

واضح طور پر سائنس اور ٹیکنالوجی تین طرح سے سماج کی خدمت انجام دے رہے ہیں: ان سے زندگی کی صفات کے نئے معیار تخلیق ہو رہے ہیں، فطرت میں شدید تبدیلیاں آ رہی ہیں اور نئی تہذیبی قدریں بتدریج اُبھر رہی ہیں۔ سائنس کے مضر اثرات بھی ہیں۔ لیکن عصری ترقی کے منفی پہلو اور عوام کی آرزوؤں کی تکمیل میں ناکامی، سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت کم نہیں کر سکتے۔ ٹیکنالوجی کی ترقی سے متعلق عوام کے شعور کو بیدار کرنے اور فطری و سماجی مظاہر کے علم کے لیے ایک نئی فہم اور بصیرت درکار ہے تاکہ کم از کم یہ جانا جا سکے اور دیکھا بھی جا سکے کہ کیا سائنس و ٹیکنالوجی کی تحقیق سماجی مقاصد کے حصول کی سمت میں ہو رہی ہے۔ دراصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ٹیکنالوجی کی ترقی کے ہر پہلو کی تشخیص ہو اور اس کا کئی زاویوں سے جائزہ لیا جائے۔ اس قدم سے سماج پر ٹیکنالوجی کے مضر اثر کو روکا جا سکے گا یا کم از کم اس کو ہلکا کیا جا سکے گا۔

جدید سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے بموجب انسانی طرز زندگی، پیداواری نظام اور تفریحات کے عوامل میں تغیرات ہورہے ہیں۔ مقامی روایات اور قدریں زوال پذیر ہورہی ہیں، ان کی جگہ نئی قدریں اُبھر رہی ہیں، اس طرح قدروں میں تبدیلی کا سلسلہ مسلسل جاری ہے جس کی وجہ سے سماج میں ایک طور سے تہذیبی بدنظمی کا ماحول پیدا ہوگیا ہے۔ کیونکہ ہر سماجی قدر تبدیلی کی حالت میں ہے اس لیے تہذیب میں استحکام نہ ہونے کے برابر ہے۔

عصری ٹیکنالوجی کی معقولیت ہر ایک فرد کو صارف سماج کی جانب ڈھکیل رہی ہے یعنی ایسا سماج جس میں ہر فرد صَرف کرنے کا خواہش مند ہے، اس کو ہر وقت خرچ کرنے کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے یہاں لوگوں میں مقابلہ ہے کہ کون زیادہ خرچ کرے۔ ترقی پذیر ممالک میں کم درجے کی ٹیکنالوجی کی ترقی ہوئی ہے، یہاں سخت سماجی پابندیاں ہیں اور آمدنی بھی کم ہے۔ جب اس کے سماج کو اعلیٰ ٹیکنالوجی سے روشناس کیا جاتا ہے تاکہ اقتصادی ترقی ہوسکے تو پرانی روایات بکھرنے لگتی ہیں۔ تیزی کے ساتھ اقتصادی ترقی حاصل کرنے کے لیے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ مقامی ٹیکنالوجیکل ترقی بین الاقوامی ترقی کے نظام سے جڑ جائے اور سماج میں اکثریت کے لیے بڑے پیمانے پر صرفے کا بلند معیار حاصل ہوجائے۔ یہ سوال کہ کیا ہندوستان بکثرت آبادی کے مدِنظر صرفے کا بلند معیار مہیا کرسکتا ہے؟ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ٹیکنالوجی کی ترقی نے عوام کے چند گروہوں کو یہ موقع فراہم کیا ہے کہ وہ غیر اخلاقی طریقوں سے دولت جمع کریں۔ دولت کمانے کے لیے اسمگلنگ، ٹیکسوں کی چوری، رشوت اور دیگر بدعنوانیوں کا عمل جاری ہے۔ اس طرح جو دولت اکٹھی ہوئی اس سے اقتصادی قوت ملی جس سے سیاسی قوت حاصل کرنے کی غرض سے اعلیٰ سماجی درجہ حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ سماج کے اس حصے سے تعلق رکھنے والوں کو سماجی عزت مل رہی ہے یہ خیال کیے بغیر کہ ان کے دولت کمانے کا طریقہ ایماندارانہ ہے یا غیر ایماندارانہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دولت سماج میں ایک اہم قدر کی حیثیت سے تسلیم ہوتی جارہی ہے۔ ٹیکنالوجی کے اس سماجی اثر نے سماجی فیصلوں کے مواقع پر ایک سنجیدہ دوجہتی حالت پیدا کردی ہے۔ یقیناً جس انداز سے ٹیکنالوجی کی ترقی ہوئی ہے اس سے سماج میں عدم مساوات میں اضافہ ہونے سے کئی افراد اور گروہوں میں انقلابی جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔ خاص طور پر نوجوانوں میں گاہے بگاہے موجودہ نظام کے خلاف انقلابی جذبے کی جھلک دکھائی پڑتی ہے۔ اس جذبے کی عکاسی انفرادی و گروہی تشدّد اور دہشت گردی میں جھلکتی ہے۔ ان کے اسباب کا سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ امیروں کی طمطراق اور ٹھاٹھ باٹ کی طرز زندگی بکثرت عوام میں غریبی کے فرق کو ظاہر کرتی ہے۔ عوام یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی غریبی اور ان پر جابرانہ تشدد قدرتی نظام کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ ان لوگوں کی وجہ سے ہے جو کسی بھی طرح دولت و قوت کو ہتھیانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ سماج کے اعلیٰ طبقے کے یہ لوگ دھوکہ دہی اور غیر قانونی اعمال کے لیے کسی بھی سزا کے دائرے سے باہر ہیں۔ طاقت و دولت کے مظاہرے نے سماج کے دبے کچلے طبقے کے صبر کے بندھنوں کو توڑ دیا ہے۔ جو ہتھیار جدید سائنس نے ایجاد کیے ہیں، یہی ہتھیار کمزور طبقے کے افراد کے ہاتھ لگ گئے ہیں جنھیں وہ اپنے مخالفین کے خلاف استعمال کررہے ہیں۔ اب ان مخالفین میں چاہے کوئی فرد ہو، گروہ ہو، ادارہ ہو یا پھر حکومت، ٹیکنالوجی کے استعمال کا یہ انداز عوام میں خوف کا باعث ہے اور حکومت کے لیے دردِسر۔

ہر تہذیب کا اپنا نظام قدر، ماحول، مطالبات اور آرزوئیں ہوتی ہیں۔ سائنس کو ان کے ساتھ ربط رکھنا چاہیے اور سماجی ضرورتوں کی تکمیل میں مدد دینی چاہیے۔ اس سیاق و سباق میں ہندوستانی سماج کے روبرو ایک چنوتی یہ ہے کہ عوام کی سماجی و اقتصادی ترقی کا ایک دائرۂ عمل تیار ہو جس میں وہ تمام عملی عقائد اور معروضات شامل ہوں جن پر تمام ٹیکنوکریٹ، سیاستداں، سماجی ماہرین اور مقامی سائنسی برادری کا یقین ہو اور وہ اجتماعی کوششوں سے سماجی مقاصد کو حقیقت کی شکل دیں۔ یہ ٹیکنالوجی کا متبادل راستہ ہے، لیکن موجودہ افسر شاہی، صنعتی، تعلیمی اور اقتصادی ڈھانچوں کے پیش نظر متبادل ٹیکنالوجی کا حل کمزور، پسماندہ اور ناقابلِ عمل لگتا ہے۔ متبادل ٹیکنالوجی ماڈل کی قبولیت اور اس کی ترقی کے لیے موجودہ سماجی اداروں میں دوررس تبدیلی کی ضرورت ہے۔

سائنس، ٹیکنالوجی اور سماج کے درمیان رشتوں کو ہموار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے سماج میں عدم مساوات اور ناانصافی ختم کی جائے، لیکن موجودہ سماجی، اقتصادی اور تعلیمی ادارے اس صورت کے ہیں کہ سائنسی علم کو جدید ٹیکنالوجی کی ترقی کے ماڈل سے ہٹ کر مؤثر طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ متبادل ٹیکنالوجی کے راستے کی رکاوٹوں کو ختم کرنا ہوگا۔ عالمگیریت کے باوجود اگر ہمارا سماج اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے پابند ہے تو یقیناً سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے سماجی مساوات کی بنیاد پر متبادل ترقی کے راستے کبھی معدوم نہیں ہوں گے۔ سماج کے اندر اپنی فلاح و بہبود، بقا اور تحفظ کی صلاحیت بدستور رہتی ہے۔ بشرطیکہ اس صلاحیت کو جلا بخشنے اور بروئے کار لانے کے لیے مناسب فضا پیدا کی جائے۔

(بشکریہ "سائنس کی دنیا"، دہلی، جولائی۔ ستمبر 2004)

افضل ضیا شہزادہ

علم کیمیا اور جابر بن حیان

عباسی دور کا سب سے نامور سائنس داں اور انسانی تاریخ کا پہلا باضابطہ کیمیا داں جابر بن حیان ہے۔ یورپ کے تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ تاریخ میں پہلا کیمیاداں جابر بن حیان ہے۔ سونا بنانے کی دھن نے اسے علم کیمیا کا موجد بنا دیا جس پر اس نے بہت سے تجربے کیے اور مشہور ہوگیا۔ آج پوری دنیا اسے فن کیمیا کا باوا آدم تسلیم کرتی ہے، اہل یورپ میں وہ جبیر (Geber) کے نام سے مشہور ہے جو جابر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

جابر بن حیان، عرب کے جنوبی حصے یمن کے ایک قبیلے "بنوازد" کا فرد تھا۔ اس کے خاندان کے لوگ یمن چھوڑ کر کوفہ میں آباد ہو گئے تھے، اس شہر میں اس کے والد احمد حیان کی عطاری کی دوکان تھی۔ یہ دوسری صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ ہے جب بنوامیہ کے مظالم کے ردعمل کے طور پر ان کی جگہ بنوعباس کو تخت خلافت پر متمکن کرنے کے لیے عالم اسلام کے دور دراز گوشوں میں ایک منظم تحریک شروع ہوگئی تھی۔ ایران کا شمالی صوبہ خراسان اس تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ خراسان کے مشہور شہر طوس میں اس تحریک کے کارکنان سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ یہی زمانہ ہے جب جابر بن حیان کے والد احمد حیان اس تحریک میں شامل ہوئے اور کوفہ میں اپنی عطاری کی دوکان چھوڑ کر خراسان کے شہر طوس منتقل ہو گئے۔ اسی شہر میں جابر بن حیان 721 میں پیدا ہوئے لیکن ابھی ان کی ولادت کو تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ ان کے والد کو حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم میں گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا، اس طرح جابر شیرخوارگی ہی میں یتیم ہو گئے۔

ننھے جابر اور اس کی والدہ ایک اجنبی ملک میں بے یارومددگار رہ گئے۔ اس لیے ان کی والدہ انھیں اپنے ساتھ لے کر یمن چلی گئی اور وہاں اپنے قبیلے "بنوازد" کے لوگوں کے ساتھ رہنے لگی۔ اس طرح ان کی ابتدائی زندگی ننھیال میں گزری۔ یہاں انھیں ایک لائق استاد کی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی جس کا نام حربی الحمیاری تھا۔ یہاں جابر نے قرآن پاک کے علاوہ ریاضی اور دوسرے علوم کی بھی تعلیم پائی۔

ابھی جابر کم عمر ہی تھے کہ کوفہ کے باہر دیہات میں اپنے خاندانی رشتے داروں کے یہاں بھیج دیے گئے اور ان کے بچپن کے بقیہ دن وہیں گزرے، یہی وجہ ہے کہ تعلیم معمولی رہی۔ سن شعور کو پہنچنے پر کوفہ آگئے، یہاں کا ماحول علمی تھا۔ وہ اس ماحول سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ مدرسے میں داخل ہو کر مروجہ تعلیم حاصل کی۔ جب جابر کی عمر چھبیس برس کی ہوئی تو وہ تحریک جس کی خاطر ان کے والد احمد حیان نے اپنی جان کی قربانی دی تھی، کامیاب ہوئی جس کی وجہ سے دولت بنوامیہ ختم ہوئی اور دولت عباسیہ قائم ہوئی۔ جابر بن حیان کی طبیعت میں تلاش و جستجو کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ انھیں سونا بنانے کی دھن سوار ہوئی، لہٰذا کوفہ میں شارع باب الشام کے ایک کوچے میں جو "درب الذہب" (سناروں کی گلی) کے نام سے مشہور تھا، انھوں نے اپنی تجربہ گاہ قائم کی۔ سونا بنانے کی دھن اور نئے تجربات نے جابر کے شوق کو ابھارا، علم کیمیا پر بہت سے تجربے کیے، اس کا گھر تجربہ گاہ بن گیا۔ وہ ہمہ وقت نئے نئے تجربوں میں معروف رہتے تھے، اس لگن نے انھیں علم کیمیا کا موجد بنا دیا۔

جابر کے متجسس ذہن و دماغ نے بہت سے نئی نئی چیزیں ایجاد کیں اور اس فن میں وہ بہت مشہور ہوئے، یہاں تک کہ ان کی شہرت بغداد تک پہنچ گئی تو ہارون رشید کے دوسرے وزیر جعفر برمکی نے جابر کو بغداد بلایا اور وہ چند سال تک بغداد ہی میں مقیم رہے، اس دوران متعدد بار خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں باریابی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ بغداد میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے علم کیمیا پر جو کتاب لکھی وہ ہارون رشید ہی کے نام سے معنون کی تھی۔ بعد ازاں ہارون رشید سے بہت کچھ انعام و اکرام لے کر کوفہ واپس آگئے اور یہاں کیمیائی تحقیقات اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔

جابر بن حیان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور انھیں یونانی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ اپنے زمانے کے ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جنھوں نے یونانی زبان سے براہ راست علم حاصل کر کے اسے عربی زبان میں منتقل کیا۔ اگرچہ جابر کی تحقیق کا اصل میدان کیمیا تھا لیکن ان کی بعض مشہور تصنیفات دیگر علوم پر بھی تھیں۔ اقلیدس کے ہندسے اور بطلیموس کی "مجسطی" پر جو اس زمانے میں جیومیٹری اور ہیئت کی بہت مشہور کتابیں تھیں، جابر نے ان کی شرحیں تحریر کی تھیں۔ علاوہ ازیں منطق، علم شاعری، انعکاس روشنی پر بھی

رسالے تحریر کیے تھے۔

جابر کے مجموعۂ تصانیف کا تعلق دنیائے اسلام میں علوم کی تاریخ سے ہے۔ اس کی جملہ تصانیف سے حسب ذیل علوم کا مطالعہ کیا گیا ہے، کیمیا گری، علم نجوم، علم سحر، علم خواص اشیا، علم موسیقی، علم الاعداد اور علم الحروف۔ ان تمام علوم میں ایک بنیادی خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ اسلام کے باطنی اسرار و رموز کو یونانیت، فیثا غورث کے فلسفے، مشرقی کیمیا گری اور حتیٰ کہ مشرق بعید کے عوامل و عناصر سے بھی ہم آہنگ کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے مغرب کے قابل مستشرقین مثلاً پا کراؤس رُسکا، ہومہ یارڈ اور سٹیپلیٹن کی قابل داد کاوشوں کے باوجود فن کیمیا کے بادا آدم جابر بن حیان کی چند ہی تصانیف انگریزی خواں طبقے کے مطالعے میں آسکی ہیں۔ اردو زبان میں چند مقالات کے سوا کوئی مستقل تصنیف اس عظیم کیمیاداں پر موجود نہیں ہے۔

جابر بن حیان کے زمانے میں کیمیا کی ساری کائنات ''مہوسی'' تک محدود تھی۔ یہ وہ علم تھا جس کے ذریعے کم قیمت دھاتوں مثلاً پارے یا تانبے یا چاندی کو سونے میں منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور جو لوگ اس کوشش کو اپنی زندگی کا محور بنالیتے تھے وہ ''مہوس'' کہلاتے تھے۔ جابر اگرچہ یہ یقین رکھتے تھے کہ کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی تحقیقات کا دائرہ اس کوشش رائیگاں سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ وہ کیمیا کے تمام تجرباتی عمل مثلاً حل کرنا، فلٹر کرنا، کشید کرنا، عمل تصعید سے اشیا کا جوہر اڑانا اور قلماؤ کے ذریعے اشیا کی قلمیں بنانا وغیرہ ان سب سے واقف تھے اور یہی وہ نمایاں اوصاف ہیں جن کے باعث ان کا شمار قدیم زمانے کے ممتاز سائنس دانوں میں ہوتا ہے۔ بقول جابر:

''کیمیا میں سب سے ضروری شے تجربہ ہے جو شخص اپنے علم کی بنیاد تجربے پر نہیں رکھتا وہ ہمیشہ غلطی کرتا ہے، پس اگر تم کیمیا کا صحیح علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو تجربوں پر انحصار کرو اور صرف اسی علم کو صحیح جانو جو تجربے سے ثابت ہوجائے۔ ایک کیمیاداں کی عظمت اس بات میں نہیں ہے کہ اس نے کیا کچھ پڑھا ہے بلکہ اس بات میں ہے کہ اس نے کیا کچھ تجربے کے ذریعے ثابت کیا ہے۔''

جابر کا سب سے اہم نظریہ گندھک اور پارہ کا نظریہ ہے۔ ان کے بقول ''تمام دھاتیں گندھک اور پارہ سے بنی ہیں۔ جب دونوں اشیا بالکل خالص حالت میں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو سونا پیدا ہوتا ہے لیکن جب وہ غیر خالص حالت میں کیمیائی طور پر ملتی ہیں تو دیگر کثافتوں کی موجودگی اور ان کی کمی بیشی سے دوسری دھاتیں مثلاً چاندی، سیسہ، تانبا اور لوہا وغیرہ وجود میں آتی ہیں۔'' میں نے جتنی بار بھی گندھک اور پارے کی کیمیائی ملاپ کی کوشش کی ہے اس کے نتیجے میں ہمیں شنگرف حاصل ہوا ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ وہ گندھک جس کو پارے کے ساتھ کیمیائی طور پر ملانے سے سونا بنتا ہے اس عام گندھک کے علاوہ کوئی اور شے ہے۔''

جابر کے اسی بیان کی وجہ سے بعد کے لوگوں نے اس فرضی گندھک کا نام ''گوگرد احمر'' (یعنی سرخ گندھک کی خالص قسم) رکھ لیا تھا جس کی تلاش میں وہ اپنی ساری عمر اور سارے وسائل صرف کردیتے تھے لیکن یہ ''گوگرد احمر'' حقیقت میں کسی کو نہیں ملی۔

جابر نے اپنی کیمیا کی کتابوں میں فولاد بنانے، چمڑے کو رنگنے، دھاتوں کو مصفّیٰ کرنے، بالوں کو سیاہ کرنے کے لیے خضاب تیار کرنے، موم جامہ (یعنی وہ کپڑا جس پر پانی اور دیگر رطوبات کا اثر نہ ہو) بنانے، لوہے کو زنگ سے بچانے کے لیے اس پر وارنش کرنے اور اس قسم کی بیسیوں مفید اشیا بنانے کے طریقے بیان کیے۔ ان اشیا کی تیاری موجودہ زمانے میں کافی مشکل سمجھی جاتی ہے اور اسے سرانجام دینے کے لیے فنی مہارت درکار ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جب کیمیا کا علم موجودہ زمانے کی بہ نسبت کافی محدود تھا، جابر کے لیے ان کارآمد اشیا کا تیار کرلینا صنعتی کیمیا میں اس کے اعلیٰ علم اور بے مثل فنی مہارت کی دلیل ہے۔

علاوہ ازیں جابر نے اپنی کتابوں میں سفیدہ (Lead Carbonate)، سنکھیا (Arsenic) اور کحل (Antimony) کو ان کے سلفائڈ (Sulphides) سے حاصل کرنے کے طریقے بھی تفصیل سے قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے ست لیموں (Citric Acid)، سرکہ (Acetic Acid) جیسے نباتاتی تیزابوں کو پہلی بار ''قرع انبیق'' کی مدد سے تیار کیا تھا۔

آلات کیمیا میں ''قرع انبیق'' (Distillation Apparatus) جابر کی خاص ایجاد ہے جس سے کشید کرنے، عرق کھینچنے اور ست یا جوہر نکالنے کا کام لیا جاتا تھا۔ یہ آلہ الگ الگ برتنوں پر مشتمل ہوتا تھا جن میں سے ایک کو ''قرع'' اور دوسرے کو ''انبیق'' کہتے تھے۔ ''قرع'' صراحی کی شکل کا ہوتا تھا جبکہ ''انبیق'' بھبکے کی شکل کا ہوتا تھا جس کے پہلو میں ایک لمبی نلی لگی ہوتی تھی۔ ''قرع'' اور ''انبیق'' دونوں عمدہ چکنی مٹی کے بنائے جاتے تھے اور انھیں خاص طریقوں سے پکایا جاتا تھا۔ یہ آج بھی مستعمل ہے۔ اس آلے کے ذریعے عرق کشید کرنے سے جڑی بوٹیوں کے لطیف اجزا آجاتے ہیں اور اس کے اثرات محفوظ رہتے ہیں۔

''قرع انبیق'' کی مدد سے جابر نے جو تجربے کیے ان میں پہلا قابل ذکر تجربہ یہ ہے کہ اس نے پھٹکری (Alum) ہیراکسیس (Femus Sulphate)

اور قلمی شورے (Nitre) کو گرم کرکے شورے کا تیزاب بنایا تھا۔ اپنے دوسرے کامیاب تجربے میں انھوں نے تین اشیا میں سے قلمی شورے کو خارج کردیا اور صرف پھٹکری اور ہیراکسیس کو حرارت پہنچا کر ہیراکسیس کا تیل حاصل کیا جسے موجودہ زمانے میں گندھک کا تیزاب (سلفیورک ایسڈ) کہتے ہیں۔ مگر اپنے تیسرے کامیاب تجربے میں انھوں نے ان اشیا یعنی پھٹکری، ہیراکسیس اور قلمی شورے میں ایک چوتھی چیز نوشادر کا اضافہ کیا اور ان چاروں اشیا کو ''قرع انبیق'' میں حرارت پہنچا کر ایک نیا تیزاب حاصل کیا جس کا نام اس نے ''ماء الملوک'' (Aqua Regina) رکھا تھا۔ لفظ ''نوشادر'' کا اضافہ عربی زبان میں پہلی بار جابر کی کتابوں میں دیکھا گیا۔

جابر کے تجربات سے سات دھاتیں منسوب کی جاتی ہیں سونا، چاندی، سیسہ، قلعی، تانبا، لوہا اور خارسینی، مؤخرالذکر دھات خارسینی کو ابھی تک پورے طور پر نہیں پہچانا جاسکا ہے۔ غالباً یہ چینی لوہا تھا۔ چینی کاریگر اس کی مدد سے ایسے شیشے تیار کرتے تھے جن میں دیکھتے ہی آشوب چشم کے مریضوں کی تکلیف دور ہوجاتی تھی۔ خارسینی سے ایسے گھنگھرو بھی تیار کیے جاتے تھے جن سے بڑی سریلی آواز نکلتی تھی۔

جابر کے نظامِ علم کا بنیادی اصول میزان ہے۔ میزان کا مطلب یہ ہے کہ مختلف دھاتوں میں خواص کا صحیح توازن موجود ہے۔ ہر دھات کے دو ظاہری خواص ہیں اور دو باطنی خواص، مثال کے طور پر سونا گرم اور مرطوب ہے لیکن بباطن سرد اور خشک ہے، اس کے برعکس چاندی باہر سے سرد اور خشک ہے لیکن اندر سے گرم اور مرطوب۔ جابر کے نزدیک اعتدال اور توازن کا انحصار اس پر ہے کہ عناصر کو ان کی طبیعت یا خاصیت پر لے آیا جائے جو کم ہو اسے زیادہ کیا جائے اور جو زیادہ ہو اسے کم کیا جائے۔ عناصر کو کم وبیش کرنے سے جو ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اسی کو میزان کہتے ہیں۔

جابر ارسطو کے وضع کردہ چار عناصر (آگ، پانی، ہوا، مٹی) کو تسلیم کرتے تھے لیکن انھوں نے اس فلسفے کو بالکل مختلف زاویے سے دیکھا اور اسے جداگانہ نہج پر ترقی دی۔ ان چار عناصر کو تسلیم کرنے سے پہلے چار طبائع (حرارت، برودت، رطوبت اور یبوست) کو ہر وجود کے ساتھ وابستہ کرتا تھا۔ جابر کا یہ نظریہ ہے کہ زمین میں مختلف قسم کی دھاتیں سیاروں کے اثر سے وجود میں آئی ہیں لیکن جدید سائنس کے مطابق سورج اور تمام ستاروں میں مادہ مستقل طور پر توانائی میں تبدیل ہورہا ہے، جوہروں کا انشقاق یعنی ٹوٹ پھوٹ کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور اس طرح جو توانائی خارج ہوتی ہے وہ حرارت اور روشنی کی صورت میں ہم تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ خلا کی لامحدود پہنائیوں میں بعض ایسے مادی اجزا موجود ہیں جو زمین پر موجود نہیں لیکن زمین پر ابھی تک کسی ایسے مادے یا عنصر کا پتہ نہیں چلا ہے جس کے وجود سے خلا محروم ہو۔ اس لیے اگر جابر نے آج سے بارہ سو سال پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین میں وجود میں آنے والی مادی اشیا سیاروں اور ستاروں کا نتیجہ ہیں تو اس سے اس کی عظمت اور علمی مرتبے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اگر آپ جابر بن حیان کے زمانے کا تصور کریں تو آپ قائل ہوجائیں گے کہ اس کے اچھوتے نظریے اپنی جگہ سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ سونا بنانے کی ترکیب جاننے کے لیے اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم کیمیا گروں کا سونا بنانے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا۔ کیمیاداں سونا بنانے میں کامیاب بھی ہوئے تو صرف گزشتہ صدی میں جب وہ ایٹم کی اندرونی ساخت کو سمجھنے کے قابل ہوئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا بنایا ہوا سونا کانوں سے نکلے ہوئے سونے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہنگا ہے۔ اس زمانے کے کیمیاداں، اگرچہ سونا بنانے کے جنون میں بری طرح مبتلا تھے۔ تاہم جابر اس حقیقت کے قائل تھے کہ تجرباتی طور پر تانبے کو سونے میں منتقل کرنا محض تضیع اوقات ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ہر شے کی اصلیت اور ماہیئت ایک خصوصی مقدار کے تابع ہے۔ اسی عقیدے کی بنا پر جابر نے کیمیا کی تاریخ میں میزان کے عنوان سے بالکل جدید اور انقلابی تصور کا اضافہ کیا اور اس کی وضاحت اپنی تصنیف ''کتاب المیزان'' میں بیان کی ہے۔

کیمیاگری میں جابر کے کارنامے ایک عالم کو حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کا بچپن تنگ دستی اور پریشانیوں میں گزرا۔ لیکن ان ناسازگار حالات کے باوجود انھوں نے اپنی محنت، قابلیت اور ذہانت سے سائنس میں اپنے لیے وہ مقام حاصل کرلیا جو اس زمانے میں کسی اور کو حاصل نہ تھا۔

جابر بن حیان نے 817 میں اس دارفانی سے کوچ کیا اور رحلت کے وقت اس کی عمر پچانوے برس کی تھی۔ کثرت تجربہ ومطالعہ کی وجہ سے اس کی آنکھیں خراب ہوگئی تھیں۔ امریکی پروفیسر فلپ کے بقول ''کیمیاگری کے بے سود انہاک نے جابر سے اس کی آنکھ چھین لی لیکن اس حکیم اور عظیم دانشور نے کئی چیزیں دریافت کیں اور اصل کیمیا کی بنیاد رکھی۔ اس کا گھر تجربہ گاہ بنا ہوا تھا۔''

□□□

C-80, Abul Fazal Enclave II, (Shaheen Bagh)
Opposite-Kalindi Kunj, New Delhi-110025

جمال نصرت

پانی کا تحفظ ۔۔۔ وقت کی اہم ضرورت

زمانۂ قدیم سے کسی ملک کی طاقت کا اندازہ لگانے کے تین پیمانے رہے ہیں۔ وہاں کی آبادی، رقبہ اور پانی کی مقدار۔ دنیا کی آبادی کا 16 فی صد حصہ ہندوستان میں ہے، یہاں کا رقبہ 2.4 فی صد اور پانی چار فی صد ہے۔ رقبے کے لحاظ سے پانی تو کافی ہے مگر آبادی کے لحاظ سے ہمارے یہاں پانی بہت کم ہے۔ جس تیزی سے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے اور پانی کی قلت کا مسئلہ سامنے آ رہا ہے اس کے مدِ نظر کہا جا رہا ہے کہ اگلی عالمی جنگ پانی کے لیے ہوگی۔

اُپنشد میں کہا گیا ہے کہ انسان کا وجود پانچ عناصر سے ہے۔ یہ ہیں بھومی، گگن، وایو، اگنی اور نیر یعنی زمین، آسمان، ہوا، آگ اور پانی۔ روزِ ازل جتنا پانی اس کرۂ ارض پر تھا اتنا ہی آج بھی ہے۔ صرف پانی کی قسم بدلی ہے یعنی جو پانی پہلے صاف شکل میں زمین کے نیچے تھا وہ اب آلودہ ہو کر اوپر آ گیا ہے۔ نالی سے نالوں میں، پھر چھوٹی ندیوں سے بڑی ندیوں میں اور پھر سمندر میں مل کر کھارا ہو گیا ہے اور زمین کی مٹی بھی کاٹ کر لے جا چکا ہے۔ پانی میں طرح طرح کی گندگیاں، کارخانوں کا گندا پانی، زہریلی دوائیں، کھیتوں میں ڈالنے والی کھاد، کیڑے مکوڑے اور ان کو مارنے والی دوائیں، جوہری اور نیوکلیائی کچرے مل رہے ہیں اور ہمارے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا رہے ہیں۔ ہم نے بہت سے کنویں اور تالاب پاٹ دیے ہیں، کہیں کھیتی کر رہے ہیں اور کہیں گھر بنا رہے ہیں۔ ماحولیاتی توازن پر اس کا بھی اثر پڑ رہا ہے۔

بغیر سوچے سمجھے پانی کو برباد کرنے کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ پینے کے لیے پانی کی قلت ہو گئی ہے، زمین کی گرمی بڑھ رہی ہے۔ گرین ہاؤس گیسوں کی مقدار بڑھ رہی ہے، پہاڑوں کی برف پگھل رہی ہے، اوزون کی پرت پتلی ہوتی جا رہی ہے اور سمندر اتھلے اور بڑے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس وقت دنیا میں خشکی 29 فی صد اور آبی رقبہ 71 فی صد ہے۔ پوری دنیا کا کل پانی 140 کروڑ مربع کلو میٹر ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ زمین کی اوپری سطح پر 2.65 میٹر گہرائی تک پانی ہی پانی ہے۔ اس میں سے 97 فی صد کھارا، 2 فی صد برف کی صورت میں اور باقی ایک فی صد زمین کے اوپر نیچے، صاف اور آلودہ پانی ہے۔ جیسے کھیتی، گھریلو کاموں، کارخانوں، پن بجلی وغیرہ کے کام میں لایا جا رہا ہے۔

ایک آدمی بغیر کھانے کے تیس دن زندہ رہ سکتا ہے مگر بغیر پانی کے تین دن بھی نہیں۔ ہمارے جسم میں بھی اتنا ہی فیصد پانی ہے جتنا آبی رقبہ یعنی 71 فی صد۔ آلو میں 80 فی صد، ٹماٹر میں 90 فی صد پانی ہے۔ ایک کلوگرام گیہوں پیدا کرنے میں ایک ہزار لیٹر، پانی اور چاول میں تین ہزار لیٹر، آلو اور لوہے دونوں میں دو سو پچاس لیٹر اور سیمنٹ میں صرف پینتیس لیٹر پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

چنئی (مدراس) میں زمین سے اتنا زیادہ پانی نکالا جا چکا ہے کہ اب وہاں زمین کا پانی کھارا ہو چکا ہے کیونکہ اس میں نیچے نیچے سمندر کا پانی آ کر مل گیا ہے۔ اونچی عمارتوں میں بہت زیادہ آدمی رہتے ہیں جن کے لیے زمین سے بڑی مقدار میں پانی بجلی کی مدد سے پمپ کر کے اوپر پہنچانے کی ضرورت پڑتی ہے جس سے ایک ہی جگہ پر پانی اور بجلی دونوں کی کھپت بڑھ گئی ہے اور ماحول پر خراب اثر پڑ رہا ہے۔

محاورے کسی بھی تہذیب کا نچوڑ ہوا کرتے ہیں، یہ صدیوں میں بنتے ہیں۔ پانی کی اہمیت کا اندازہ ان محاوروں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ پانی اترنا، پانی پر چڑھنا، پانی پانی ہونا، پانی دار ہونا، پانی مانگ جانا، آنکھ کا پانی مرنا، چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا، امیروں پر پانی پھیرنا، پانی پر لکیر بنانا، کہیں لاٹھی مارنے سے پانی الگ ہوتا ہے، اس کا کاٹا پانی نہ مانگے، جائے پانی کراؤ، بن پانی سب سون، خود راہ بنالے گا بہتا ہوا پانی ہے۔ وغیرہ

سبھی تہذیبیں ندیوں کے کنارے سے ہی شروع ہوئی ہیں۔ چاہے وہ سندھ ندی، نیل ندی، وولگا، یا گنگا ندی یا کوئی اور رہی ہوں۔ پہلے ہر گاؤں میں کئی تالاب ہوا کرتے تھے اور شہروں، قصبوں کے ہر محلے میں بھی لیکن آج یہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اگر ہیں بھی تو بہت کم اور چھوٹے۔ سوال یہ ہے کہ پانی کو سمندر میں جانے سے کیسے روکا جائے تاکہ وہ زمین میں جذب ہو سکے۔ کس طرح چک ڈیم بنایا جائے، زیادہ پانی والے علاقوں کو کم پانی والوں سے کس طرح جوڑیں، ندیوں کو آپس میں کیسے جوڑیں، زمین سے کم پانی نکال کر سب کی ضرورت کس طرح پوری کریں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں پانی کی سطح تیزی سے نیچے جا رہی ہو وہاں سے پانی نکالنا کم کریں یا بند کریں۔ پانی پر قانون بنایا جائے پانی کی صحیح قیمت طے کی جائے، گندا اور زہریلا پانی زمین میں جذب ہونے سے روکا جائے۔

پانی کے تحفظ کے لیے مندرجۂ ذیل مشوروں پر عمل کیا جاسکتا ہے:

1. سمندر میں کم پانی جانے دیا جائے۔ سمندری پانی سے ناریل، مینگرو (ایک طرح کا پیڑ) لوکی، ترئی، تربوز، خربوزہ وغیرہ پیدا کریں۔
2. زمین میں بڑی مقدار میں پانی جذب کرائیں۔
3. کنوؤں اور تالابوں کو جلا بخشی جائے۔
4. بڑی تعداد میں پیڑ پودے لگائے جائیں۔
5. بیسن مینجمنٹ پر توجہ دی جائے۔ بیسن وہ سارا علاقہ ہے ہے جہاں کا پورا پانی ایک خاص نکاسی سے نکل سکتا ہو۔ اس خاص علاقے کا احاطہ کرنا ہوگا کہ اس میں زمین کے اوپر اور نیچے کل کتنا پانی ہے، کتنا دوسرے بیسن سے اس بیسن میں آرہا ہے۔ کل کتنا پانی یہاں سے دوسرے بیسن یا بیسنوں کو جارہا ہے۔ کتنی بارش ہوتی ہے، کتنی بھاپ بنتی ہے۔ کتنے پیڑ پودے ہیں اور ان میں کتنا پانی موجود رہتا ہے وغیرہ۔ بھاپ بنا کر اڑانا مقصد ہے یا کہ روکنا۔ یہاں یہ بھی ایک تکنیکی نکتہ ہے۔ بھاپ بننا اور پانی کا زیادہ گہرائی میں ہونے کا ایک دوسرے سے تعلق نہیں ہے بلکہ بھاپ بننے کے لیے آبی سطح کی لمبائی چوڑائی کتنی ہے یہ زیادہ اہم ہے۔ ہم چاہ کر بھی بھاپ بننا نہیں روک سکتے۔ مگر اسے کم تو ضرور کر سکتے ہیں۔
6. پانی کی بربادی کو روکیں یعنی اسے تالاب میں جمع کریں، یہ تالاب گہرے بھی ہوں۔ بلا وجہ زمین کو اینٹ پتھر لگا کر پکا نہ کریں۔ بلکہ کچا ہی رکھیں جس سے خوب پانی جذب ہو سکے۔
7. ماحول ٹھیک کرنے کے لیے خاص قسم کے پیڑ پودے ہوں۔ پیڑ پودے لگائیں کیوں کہ ان کی پتی، پھول، پھل، ٹہنی، تنا، سب ہی پانی کو روکے رہتے ہیں اور آکسیجن بھی دیتے ہیں۔
8. شہروں میں چھتوں کا پانی ٹیوب ویل کے ذریعے پہنچانے کی اسکیموں پر عمل درآمد کیا جائے۔ اب بڑے شہروں میں 200 مربع میٹر کے مکانوں میں اس کا انتظام لازمی بھی کر دیا گیا ہے۔
9. آبی پالیسی جسے حکومت نے 2002 میں مرتب کیا ہے اس پر عمل ہو۔
10. کارخانوں سے نکلنے والے پانی کو بغیر صاف کیے ندیوں اور نالوں میں نہ جانے دیا جائے۔ ہمیشہ صاف پانی کا استعمال نہ ہو بلکہ جیسا کام ہو اس کی مناسبت سے پانی بھی ہو۔ ایک ہی پانی کا بار بار استعمال ہو۔ اگر دوبارہ استعمال ہوگا تو بجلی بھی بچ سکتی ہے۔ اس کی خاص تربیت کی ضرورت ہے۔
11. گھروں کے فرش، کار اور اسکوٹر کی دھلائی غسل خانے اور باورچی خانے سے نکلنے والے پانی سے ہوسکتی ہے۔ اور یہ دھلائیاں کس طرح کم پانی سے کی جائیں اس کی بھی تربیت دی جائے۔
12. صابن اور تیزاب پانی کو خراب اور بیکار کرتے ہیں ان کا استعمال بھی کم کیا جائے۔ ہمارے پاس حکمت اور آیوروید ہے، جڑی بوٹیاں ہیں، نیم ہے، ریٹھا ہے، سرسوں کی کھلی ہے، آٹے کی بھوسی ہے ان کو کام میں لایا جائے۔
13. پانی بیش قیمت ہے اس لیے اسے برباد کرنے والوں سے قیمت بھی زیادہ لی جائے۔ پانی کو بھی معدنیات (Mineral) کا حصہ تسلیم کیا جائے یعنی جس طرح سطح زمین کے نیچے کی معدنیات پر حکومت کا کنٹرول ہے اسی طرح زمین کے نیچے کے پانی کو بھی اسی ذیل میں رکھا جانا چاہیے۔
14. جہاں پانی کی سطح تیزی سے نیچے گر رہی ہو وہاں پانی نکالنا اور ٹیوب ویل لگانا بند کیا جائے۔
15. پانی بچانے کے لیے ضروری ہدایتیں لوگوں کو ٹی۔وی، ریڈیو، اخبار اور ذرائع ترسیل سے دی جائیں۔
16. پانی پر قانون بنے اور ان پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سزا کا اہتمام ہو۔
17. اس سلسلے میں مذہبی رہنماؤں سے بھی مدد لی جائے۔ وہ اپنے 'وعظ' اور 'پروچن' میں اس بات کا بھی ذکر کریں کہ ہر مذہب میں پانی کی بربادی روکنے کے لیے پہلے سے ہی حکم موجود ہے۔ پانی کو نعمت کہا گیا ہے۔
18. سطح زمین پر موجود پانی اور زمین کے نیچے کے پانی کا ملا جلا استعمال ہو۔ جہاں جو بھی زیادہ ہو اس کا استعمال بھی اسی مناسبت سے کیا جائے۔
19. درسی کتابوں میں اس سے متعلق سبق ہوں کہ پانی کتنا ہے، یہ کتنا اہم ہے اور اس کی بربادی سے کیا خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ اس بارے میں تمام درجات میں بتایا جائے۔

دانش وروں کا مشورہ ہے کہ اگر پانی دوڑ رہا ہو تو اسے چلاؤ، اگر چل رہا ہو تو اسے کھڑا کرو، اگر کھڑا ہے تو اسے بٹھا دو، اگر بیٹھا ہو تو اسے سُلا دو۔ اگر ان مشوروں پر نصف بھی عمل کیا جا سکے تب بھی ہم آنے والی نسلوں کے سامنے شرمندہ نہیں ہوں گے۔

□□□

ROSHNI,
509/148,Old Hyderabad,Lucknow-226007(U.P.)

تحریر: مہندر پانڈے
ترجمہ: فیاض عالم

گرم ہوتی دنیا

زمین کے درجۂ حرارت میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور مستقبل قریب میں اس میں کمی آنے کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔ گذشتہ صدی کے دوران زمین کے اوسط درجۂ حرارت میں ایک ڈگری فیرن ہیٹ (پیمانۂ حرارت) کا اضافہ ہوا ہے۔ شمالی کرۂ ارض میں موسم سرما میں برف باری کا وقت ڈیڑھ سو سال قبل کی بہ نسبت دس دن بعد کا ہو گیا ہے جب کہ موسم بہار میں نو دن پہلے ہی برف پگھلنے لگی ہے۔ 1990 کی دہائی گذشتہ ڈیڑھ سو برسوں میں سب سے زیادہ گرم تھی اور سب سے زیادہ گرم سال بالترتیب 1998، 2002، 2003، 2004، 2001 اور 1997 تھے۔

Arctic Climate Impact Assessment (ACIA) کی ایک رپورٹ کے مطابق الاسکا، مغربی کناڈا اور مشرقی روس کا اوسط درجۂ حرارت گذشتہ پچاس برسوں کے دوران چار سے سات ڈگری فیرن ہیٹ بڑھ گیا ہے۔ الاسکا کے بیرو شہر کے درجۂ حرارت میں تو پچھلے تیس برسوں میں ہی چار ڈگری فیرن ہیٹ کا اضافہ ہو چکا ہے۔ انٹر گورنمنٹ پینل آن کلائمیٹ چینج کے مطابق موجودہ صدی کے آخر تک زمین کا درجۂ حرارت تین سے دس ڈگری فیرن ہیٹ بڑھ جائے گا۔

زمین کی ٹھنڈک اور گرمی ایک فطری عمل ہے۔ اس کے تحت تقریباً ایک لاکھ سال تک زمین نسبتاً سرد رہتی ہے اور اتنی ہی مدت تک نسبتاً گرم رہتی ہے۔ لیکن گذشتہ چند برسوں میں اس عمل میں تیزی آئی ہے۔ تقریباً 70000 سے 11,500 سال پہلے آخری برفانی دور کے دوران شمالی امریکہ اور یورپ برف سے ڈھکے تھے لیکن کسی وجہ سے تیزی سے آب و ہوا میں تبدیلی آئی۔ گرین لینڈ کے گلیشیروں کا وسیع مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب دس برسوں کے اندر درجۂ حرارت میں پندرہ ڈگری فیرن ہیٹ کا اضافہ ہو گیا۔

قطب شمالی پر موجود برف کی پرت ایک بڑی قدرتی Air Conditioning مشین کا کام کرتی ہے اور اس پر درجۂ حرارت میں اضافے کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ 1978 کے بعد یہاں کی برف کی سطح میں فی دہائی نو فیصد کی کمی آئی ہے۔ قیاس ہے کہ اس صدی کے آخر تک قطب شمالی کے درجۂ حرارت میں سات سے تیرہ ڈگری فیرن ہیٹ کا اضافہ ہوگا اور گرمیوں میں وہاں برف بالکل پگھل جائے گی۔

گلیشیر میٹھے پانی کا لامحدود ذخیرہ ہیں۔ امریکہ کا مونٹانا نیشنل پارک 1910 میں قائم کیا گیا تھا' اس وقت اس علاقے میں ڈیڑھ سو گلیشیر تھے۔ اب ان میں سے صرف تیس گلیشیر باقی ہیں۔ معتدل علاقوں میں گلیشیروں کی حالت اور نازک ہے۔ تنزانیا میں ماؤنٹ کلی منجارو کی برف کی پرت 1912 سے اب تک 80 فیصد کم ہو چکی ہے۔ 2020 تک شاید یہ پوری طرح ختم ہو جائے۔

سمندروں کے سطح کی اونچائی کئی بار بڑھی اور پھر کم ہوئی ہے۔ گذشتہ صدی کے دوران میں سمندروں کی سطح میں اوسطاً چار سے آٹھ انچ کا اضافہ ہوا ہے۔ موجودہ صدی کے آخر تک یہ اضافہ چار سے پینتیس (35) انچ تک ہونے کا اندازہ ہے۔ سمندر کے کنارے والے علاقے اس سے گہرے طور پر متاثر ہوں گے۔ سطح سمندر میں 1.5 فٹ اضافے سے سمندری ساحل پچاس میٹر آگے بڑھ جائے گا اور اتنی ہی زمین سمندر میں غرق ہو جائے گی۔ یہ ان دس کروڑ لوگوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے جو سمندر کی سطح سے ایک میٹر کی اونچائی والے علاقوں میں رہتے ہیں۔

قطبی علاقوں میں گلیشیروں کی برف پگھلنے کی شرح بڑھی ہے اور بڑے پیمانے پر میٹھا پانی سمندر کے پانی میں مل کر اس کے کھارے پن اور کثافت میں کمی لا رہا ہے۔ اس سے سمندروں کا سرکولیشن پیٹرن متاثر ہو رہا ہے۔ اسی سرکولیشن پیٹرن کی بدولت دنیا کی آب و ہوا متعین (کنٹرول) ہوتی ہے۔ اس نظام میں تبدیلی کا مطلب پوری دنیا کی آب و ہوا میں وسیع پیمانے پر تبدیلی ہے۔

1860 کے بعد صنعتی انقلاب اور جنگلوں کی کٹائی سے فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار میں 1950 کے بعد مزید تیزی آئی ہے۔ بھاپ بھی ایک اہم گرین ہاؤس گیس ہے اور درجۂ حرارت میں اضافے کے بعد بھاپ بننے کی شرح میں مزید تیزی آئے گی۔ بھاپ کے علاوہ کاربن ڈائی آکسائڈ، میتھین اور نائٹروجن آکسائیڈ کی مقدار بھی فضا میں بڑھ رہی ہے۔ یہ گیسیں فضا میں کافی عرصے تک رہتی ہیں اور ان کے اخراج پر فی الحال اگر قابو پا بھی لیا جائے تب بھی اس کے اثرات طویل مدت تک باقی رہیں گے۔

قطب شمالی میں درجۂ حرارت کے اضافے کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہاں گلیشیر کم ہو رہے ہیں اور برف باری کی مدت بھی کم ہو رہی ہے۔ برف تیزی سے پگھلنے کی وجہ سے ندیوں میں پانی کا بہاؤ بڑھ گیا ہے۔ وہاں کے مقامی قبائل

ندیوں اور سمندروں کے ساحل سے دور بسنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ گلیشیروں کے ختم ہونے کا اثر قطبی علاقے کے بھالوؤں، تیندوؤں، سیل اور پنگوئن کی نسلوں پر بھی پڑے گا۔

تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ یورپ کے متعدد پودوں میں پھول کھلنے کا وقت 1950 کی بہ نسبت ایک ہفتہ پہلے ہو گیا ہے اور خزاں کا وقت پانچ دن آگے چلا گیا ہے۔ متعدد پرندوں اور مینڈکوں کی نسلوں میں پہلے کی بہ نسبت بچے جلدی پیدا ہونے لگے ہیں۔ یورپ میں تتلیوں کی کم سے کم پینتیس قسمیں ایسی پائی گئی ہیں جنھوں نے ایک دہائی کے اندر اپنا ٹھکانہ ساڑھے تین کلومیٹر سے دو سو چالیس کلو میٹر تک شمال میں بنا لیا ہے۔ اندازہ ہے کہ 2050 تک انسانی سرگرمیوں سے اخراج شدہ کاربن ڈائی آکسائڈ اور دیگر گیسوں کے اثر سے پودوں اور جانوروں کی لاکھوں قسمیں خطرے میں پڑ سکتی ہیں۔

پرسکون اور دھوپ والے ماحول میں سمندروں کی سطح کا درجۂ حرارت 29-5 ڈگری سیلسیس تک پہنچ جاتا ہے اور اس میں رہنے والے کورل ریف کا رنگ پھیکا پڑنے لگتا ہے کیوں کہ زیادہ تر بحری نباتات اس کی سطح سے اتر جاتے ہیں۔ کورل ریف ایک پیچیدہ ماحولیاتی نظام (Ecosystem) ہے اور مختلف جانداروں کا اس پر انحصار ہے۔ اس نظام میں کوئی بھی تبدیلی ان جانوروں کے لیے مضر ثابت ہو سکتی ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ درجۂ حرارت میں اضافے کے محض منفی اثرات ہی نہیں ہیں۔ اس سے سرد علاقوں میں مکانوں اور دفتروں کو گرم رکھنے میں توانائی کی کھپت کم ہوگی اور بے حد ٹھنڈے علاقوں میں زیادہ قابلِ زراعت زمین دستیاب ہوگی۔ اس کی بدولت قطب شمالی کے آس پاس پانی جہازوں کی آمد و رفت میں آسانی ہو جائے گی اور اس علاقے میں معدنیات کی تلاش کے لیے زیادہ علاقہ فراہم ہوگا۔

(بشکریہ "جن ستا" نئی دہلی، 26 رجون 2005)

تنقیدی افکار

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1983 میں چھپا تھا۔ 1986 میں اسے ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا۔ اس میں نظری تنقید، نظریہ نقد اور مشرق و مغرب کی شعریات کے حوالے سے اہم مضامین شامل ہیں۔ تین نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ کونسل نے اس اہم کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 348، قیمت: -/148 روپے

اردو میں نظمِ معریٰ اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

مصنف: پروفیسر حنیف کیفی

نظم معریٰ اور آزاد نظم کے موضوع پر یہ کتاب دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔ مصنف نے اپنی شعری روایت کو نظر میں رکھتے ہوئے مغرب میں ان اصناف کے ارتقا کا جائزہ لیا ہے اور مستند نقادوں نے ان کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، ان کے حوالے سے اپنی گفتگو کو وقیع بنایا ہے۔

صفحات: 608، قیمت: -/182 روپے

کلیاتِ میر (جلد اوّل)

مرتب: ظلِ عباس عباسی / تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ

"کلیاتِ میر" کے اس نسخے کی بنیاد ظلِ عباس عباسی مرحوم کے مرتب کردہ نسخے پر ہے جو پہلی بار 1968 میں شائع ہوا تھا اور جو مکمل دیوانِ غزلیات پر مشتمل تھا۔ اس ایڈیشن میں کتابت اور قرأت کی وہ غلطیاں دور کر دی گئی ہیں جو متن میں راہ پا گئی تھیں اور وہ اشعار بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو دوسرے معتبر ماخذ سے حاصل ہوئے ہیں۔ ابتدا میں میر کی زندگی اور شاعری پر مستند اہلِ قلم کی تحریریں، ان کے اہم اقتباسات بھی شامل ہیں۔ میر کے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک گراں بہا تحفے کی طرح ہے۔

صفحات: 870، قیمت: 336 روپے

وثائقِ فورٹ ولیم کالج

مصنف: راجندر ناتھ شیدا

فورٹ ولیم کالج اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب ان وثائق کا مجموعہ ہے جو فورٹ ولیم کالج کے قیام اور اس کی تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق نہایت مفید اور مستند معلومات فراہم کرتے ہیں۔ یہ وثائق آنجہانی راجندر ناتھ شیدا نے نہایت احتیاط اور سلیقے کے ساتھ نقل کیے تھے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کا جامع مقدمہ بھی شاملِ کتاب ہے۔

صفحات: 407، قیمت: -/153 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

حکیم اشہر قدیر

یرقان (پیلیا)

پانی زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات بھی ہر شخص جانتا ہے کہ پینے کا پانی صاف ہونا چاہیے۔ لیکن آج کل انسان حالات کے تحت اتنا مجبور ہے کہ اس کو کچھ ہوش نہیں کہ جو پانی وہ پی رہا ہے وہ صاف ہے کہ آلودہ۔ وہ تو پیاس کے وقت ایک گلاس پانی میسر آنے کو ہی غنیمت سمجھتا ہے۔ گرمیوں میں حالات اور بھی سنگین ہو جاتے ہیں۔ آپ اپنے گھر میں صاف پانی کا انتظام بھلے ہی کر لیں لیکن گھر سے باہر کام کاج کی جگہ یا سفر کے دوران پانی کہاں ملے، کیسا ملے کچھ پتہ نہیں اور چونکہ پانی تو بہر حال پینا ہے، اس ضرورت کو دیکھتے ہوئے پانی کی تجارت جو بسلیری (Bisleri) سے شروع ہوئی تھی' آج عروج پر ہے اور نہ جانے کتنی کمپنیاں مختلف ناموں سے عوام کو صحت بخش پانی مہیا کرانے میں پیش پیش ہیں۔ لیکن سب کی جیب تو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ دس بارہ روپئے کا پانی خرید کر پیے اور صبح سے شام تک پانی کا بل ہی سو روپئے کا ہو جائے اور روٹی کھانے کے لیے پیسے ہی نہ بچیں۔ غرض کہ آج عوام کی اکثریت اس طرح کا پانی پینے کے لیے مجبور ہے جس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ وہ صاف ہے کہ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ گرمیوں میں ایسی بیماریاں زیادہ ہوتی ہیں جو پانی میں آلودگی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں ہیضہ، ٹائیفائڈ اور یرقان (پیلیا) زیادہ خطرناک ہیں۔ پیلیا جگر کی بیماری ہے، جگر میں ورم (Hepatitis) طبعی مقدار سے زیادہ ہو جاتا ہے اور چونکہ یہ مادّہ زرد رنگ کا ہوتا ہے اس لیے سب سے پہلے مریض کی آنکھیں پیلی دکھائی دیتی ہیں۔ مرض کے شدّت اختیار کرنے کی صورت میں کبھی کبھی پورا جسم پیلا ہو جاتا ہے اور اسی مناسبت سے اس مرض کو پیلیا کہتے ہیں۔ یہاں یہ بات اہم ہے کہ جگر میں ورم لاحق ہونے کے کئی اسباب ہیں جن کی وجہ سے پیلیا ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ نو زائیدہ بچے میں پیدائش سے ایک یا دو دن بعد پیلیا پایا جاتا ہے جو کہ ایک قدرتی امر ہے۔ چونکہ بچہ شیر خوار ہوتا ہے، منہ سے کوئی دیگر غذا یا گندگی نہیں جاتی اس لیے یہ خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر بچے کا رنگ کچھ زیادہ ہی پیلا مثل ہلدی ہو جائے تو پھر ڈاکٹر سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ اگر بڑے بچوں، جوانوں یا بوڑھوں کو پیلیا ہو جائے تو یہ ایک مرضی کیفیت ہے جس کا علاج ضروری ہے۔

اگر کسی بستی یا محلے میں بیک وقت پیلیا کے مریض موجود ہوں تو سمجھنا چاہیے کہ وہاں پینے کے پانی میں آلودگی ہے۔ اسی طرح اگر بچہ اسکول جاتا ہے اور اس کو پیلیا ہو گیا تو بہت ممکن ہے کہ اُس کے اسکول میں پینے کے پانی کا معقول انتظام نہ ہو۔ ایسی صورت میں اسکول کے بچے اور عملہ اس مرض میں مبتلا ہو سکتے ہیں، لیکن اس بات کی تصدیق کے لیے کہ پیلیا کا سبب گندا پانی یا گندی غذا ہے، خون کی جانچ بے حد ضروری ہے جس کے لیے اپنے فیملی ڈاکٹر یا قریبی ہیلتھ سینٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ پیلیا ایک دم نمایاں ہو جائے بلکہ بہت ممکن ہے کہ پیلیا نمایاں نہ ہو لیکن مریض کو پیٹ میں داہنی پسلیوں کے نیچے بوجھ اور درد محسوس ہو اور ساتھ ہی ساتھ بھوک میں کمی آ جائے تو یہ پیلیا کے آغاز کی خاص علامات ہیں اور بعد میں جب مرض بڑھتا ہے تو پہلے آنکھیں اور پھر تمام جسم زرد ہو جاتا ہے۔ کھانے کی خواہش نہیں ہونا اور متلی یا قے آنا پیلیا کی خاص علامات ہیں۔ اس میں ہلکا یا تیز بخار بھی ہو سکتا ہے۔ پیشاب کا زرد ہو جانا بھی یقینی ہے۔

یہ علامات ظاہر ہوتے ہی ڈاکٹر یا قریبی اسپتال سے رجوع کرنا چاہیے۔ مریض اپنے طور پر جو تدابیر اختیار کر سکتا ہے وہ یہ ہیں کہ پانی اُبال کر استعمال کریں۔ کھانے میں روغنی اور ثقیل چیزیں بالکل نہ لیں۔ حتّٰی کہ دودھ کی بالائی اور مکھن بھی نہ لیں۔ ہلکی اور سیال غذا کھائیں جیسے بغیر گھی' تیل میں پکی ہوئی دال اور سبزی، سوپ، پتلی کھچڑی، سادہ دلیا وغیرہ۔ اس مرض میں مولی کی سبزی یا مولی کا سوپ بہت مفید ہوتا ہے۔ اسی طرح پکے ہوئے میٹھے پھل مفید رہتے ہیں۔ صاف ستھرا گنے کا رس اس میں دوا کا کام کرتا ہے۔ پیٹھے کی مٹھائی بھی سود مند ہے۔ غذا میں احتیاط اور پرہیز کے علاوہ اس مرض میں آرام بھی بہت ضروری ہے۔

احتیاط: معالج سے رجوع کر کے خون کی جانچ ضرور کروائیں تا کہ پیلیا کے صحیح سبب اور خون میں Billirubin کی مقدار کا صحیح پتہ چل سکے۔ اگر اس کی مقدار خطرناک حد تک بڑھی ہوئی ملے تو گھر پر علاج نہ کریں بلکہ اسپتال میں داخل ہو کر علاج کروائیں۔ ہاں اگر Billirubin کی مقدار زیادہ نہ بڑھی ہو تو یونانی طب کا ایک نسخہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے جو پیلیا کے ازالے اور جگر کو تقویت دینے کے لیے اکسیر ہے۔

صبح وشام: عرق مکوہ سبز مروّق۔ 50 ملی لیٹر۔
عرق کاسنی سبز مروّق۔ 50 ملی لیٹر۔
دوپہر میں کھانے کے بعد: جوارش زنجبیل۔ 8 گرام
رات: معجون دبید الورد۔ 8 گرام،
عرق برنجاسف۔ 50 ملی لیٹر۔

اس نسخے کے ساتھ غذا اور احتیاط وہی رہے گی جو اوپر بیان کی گئی۔ اگر مریض بچہ ہے تو عمر کے لحاظ سے دواؤں کی مقدار میں تخفیف کرنی ہوگی۔ تحفظ، علاج سے بہتر ہے، چنانچہ اس سے قبل کہ یہ عارضہ کسی کو لاحق ہو جائے، پانی کی صفائی کا خیال رکھیں۔ پانی کو جہاں تک ممکن ہو اُبال کر پئیں۔ کنوؤں اور تالابوں کو صاف رکھیں۔ سرکاری پائپ لائن پر نظر رکھیں۔ اگر پانی کے رنگ یا بو میں تبدیلی معلوم ہو تو فوراً کارپوریشن کو مطلع کریں۔ اسی طرح گھر میں پانی کے برتن، گھڑے اور ٹنکیاں وغیرہ صاف کرتے رہیں۔ اسکولوں میں پانی کی صفائی ستھرائی کا خاص اہتمام کیا جائے۔ یونیورسٹیوں میں جہاں طلبہ ہاسٹل میں رہتے ہیں وہاں کی پانی کی ٹنکیاں مہینے میں ایک بار ضرور صاف ہونی چاہئیں۔ گھر سے باہر جہاں تک ممکن ہو، ہر جگہ کا پانی نہ پئیں۔ اگر کسی نل یا پانی کے ٹینک پر لال رنگ لگا ہو تو اُس کا پانی نہ پئیں۔ بہتر ہے کہ سفر کے دوران اپنی ضرورت کا پانی ساتھ لے کر چلیں۔ اس طرح سے نہ صرف پیلیا بلکہ کئی اور بیماریوں سے صحت کی حفاظت ممکن ہے۔

□□□

157/A, Ghaffar Manzil, Jamia Nagar,
New Delhi-110025

عروض، آہنگ اور بیان

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے عہد کے معتبر ترین علمائے ادب میں ہیں۔ اس کتاب میں ان کے دس اہم مضامین شامل ہیں جن میں شاعری کے محاسن و معائب کے مروّجہ پیمانوں کے جواز اور عدم جواز پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔۔۔ اس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر تین نئے مضامین کے اضافوں کے ساتھ اردو کونسل نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

صفحات: 340، قیمت: -/144 روپئے

کلیات آغا حشر کاشمیری

مرتبین: آغا جمیل کاشمیری اور یعقوب یاور

آغا حشر اردو کے پہلے ڈراما نگار ہیں جن کے ڈراموں کو ملک بھر میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے ڈراموں کی اسی غیر معمولی مقبولیت کی بنا پر انھیں انڈین شیکسپیئر بھی کہا گیا۔۔۔ ان کے تمام ڈراموں کا مستند متن جناب آغا جمیل کاشمیری اور جناب یعقوب یاور نے بڑی محنت سے اردو کونسل کے لیے مرتب کیا ہے جو آٹھ ضخیم جلدوں میں شائع ہوگا۔ تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

صفحات (تینوں جلدیں): 1202، قیمت: -/460 روپئے

جامعہ کی کہانی

مصنف: عبدالغفار مدھولی

اس کتاب میں موصوف نے جامعہ کی تاسیس سے 1947 تک کی جامعہ کی کارگزاریوں کی تفصیل بڑے دل نشیں پیرائے میں قلم بند کی ہے جو معلومات افزا تو ہے ہی، ساتھ ہی تعلیمی میدان میں کام کرنے والوں کو ایک نیا جذبہ اور حوصلہ بھی دے گی۔ کتاب میں مختلف موقعوں کی 26 تصویریں بھی شامل ہیں۔

صفحات: 496، قیمت: 140 روپئے

ایک معلم کی زندگی

مصنف: عبدالغفار مدھولی

یہ جناب عبدالغفار مدھولی کی آپ بیتی ہے جو دو جلدوں میں ہے۔ اس میں انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اپنی طویل وابستگی اور کارکردگی کی روداد سلیس اور سادہ زبان میں اس دلچسپ انداز میں بیان کی ہے کہ ایک بار کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا جائے تو پھر کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہ چاہے گا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ جامعہ کے قیام اس کے مقاصد اور اس کی تدریجی ترقی کا تفصیلی ذکر بھی کرتے گئے ہیں۔ مدھولی صاحب کے اوّل مخاطب بچے ہیں لیکن بڑوں بالخصوص اساتذہ کے لیے بھی اس کتاب کی افادیت مسلّم ہے۔

صفحات (دو جلدیں): 557، قیمت: -/252 روپئے

عکس اور برعکس

مصنف: سدھا مورتی / مترجم: ابوالکلام

یہ محترمہ سدھا مورتی کی 52 کہانیوں کا مجموعہ ہے جو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مصنفہ نے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا ہے اور تقریباً ایک ہزار گاؤں کے لوگوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہ کہانیاں ان کے اسی مشاہدے کی دین ہیں۔ مصنفہ نے صرف نام بدل دیے ہیں، کہانیوں کا ماحول اور کردار دونوں حقیقی ہیں۔۔۔ یہ کہانیاں 12 مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

صفحات: 230، قیمت -/128 روپئے

اللہ کے مقدس نام

مصنف: پرویز دیوان / مترجم: محمد اطہر

عام علمائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ کے 99 نام ہیں جو صفاتی ہیں یعنی اللہ کی کسی صفت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اللہ کے تین ہزار نام ہیں جن میں وہ نام بھی شامل ہیں جن کا ذکر یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں میں آیا ہے۔۔۔ اس کتاب میں جناب پرویز دیوان نے اللہ کے دو سو سے کچھ زائد ناموں کو شامل کیا ہے اور ان کے خواص اور برکات کا بھی ذکر کیا ہے۔

صفحات: 364، قیمت: -/166 روپئے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شہیر عباسی

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد

ہندوستانی تاریخ کی اکثر کتابوں میں شمالی ہند کو پورے برصغیر کا مترادف ہے جس کے نتیجے میں ہندوکش کے پار سے ہونے والے حملوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی اور جنوبی ہند کے علاقوں کو محض شمالی سلطنتوں کے ماتحت علاقے کی حیثیت دی گئی، خواہ وہ اشوک کی سلطنت ہو، سمدر گپت کی یا ہرش کی سلطنت۔ یہاں تک کہ جنوبی ہند پر علاء الدین خلجی، ملک کافور اور اورنگ زیب کے حملوں کے سیاق میں بھی اس کی وہی حیثیت رہی۔

جغرافیائی صورت حال کی بنا پر، گنگا کے میدانوں کی جانب سے دکنی میدان مرتفع پر ہونے والے حملے عام طور سے اڑیسہ کی بالاسور کھائی (Balasore Gap) کے ذریعے ہوتے تھے جو مشرقی ساحل سے لگا ہوا تھا۔ یہ زیادہ آسان اس وجہ سے تھا کہ گجرات سے لے کر راج محل تک پھیلے ہوئے اراولی اور وندھیاچل کے پہاڑی سلسلوں کے گھنے جنگلات گنگا کے میدانوں اور دکنی میدان مرتفع کے لوگوں کے درمیان حد فاصل کا کام کرتے تھے۔

اس طرح فطری طور پر ملک کے یہ دونوں حصے مختلف خصوصیات کے حامل تھے۔ خشکی سے محصور شمالی ریاستوں کے برخلاف، جنوبی علاقے کی ریاستیں، اپنے دونوں اطراف میں طویل ساحلوں کے ساتھ ایک بحری طاقت بن کر ابھرنے اور فن تعمیر، آرٹ اور ادب کے شعبوں میں نمایاں کارکردگی اور اعلیٰ سطحی شان و شوکت حاصل کرنے کی محرک تھیں۔ جبکہ ایک طرف شمال ہندوکش کے پار سے ہونے والے حملوں کو روکنے کی جدوجہد کر رہا تھا، وہیں جنوبی علاقوں کے امن و سکون کے ماحول میں زندگی کی اعلیٰ قدروں کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جنوب جنگی امور میں بھی شمال سے آگے تھا۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ برصغیر میں توپوں کا استعمال پہلی بار جزیرہ نما ہندوستان میں (بہمنی ریاست اور وجے نگر کے درمیان 1360 میں) ہوا نہ کہ شمالی ہندوستان میں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوستانی مرچ، مسالوں اور سوتی کپڑوں میں مغرب کی دلچسپی بحری تعلق کی بنیاد پر تھی، جو عیسوی سال کے قبل ہی سے قائم تھا۔ پلائنی (Pliny) (circa77AD) کے مطابق عیسوی سال کے آغاز سے بھی بہت پہلے سے روم اشیا کی درآمد پر ہر سال دس کروڑ دینار (Sesteces) کی ادائیگی کرتا تھا۔ ہندوستان اور مشرقی ایشیا سے بڑے پیمانے پر کپڑے، مسالے، صندل، نیل اور موتی بحری راستے سے بھیجے جاتے تھے۔ مصر کے ساحلوں سے رومی جہاز، ہندوستان کے مغربی ساحلوں کے بندرگاہوں سے مستقل رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔ جنوبی ہندوستان کے وسیع علاقوں میں بڑے پیمانے پر عیسوی صدی کے اولین رومی سکوں کی دریافت سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اولین تمل ادب بھی بیرونی ملکوں کے ساتھ بحری تجارت کے حوالوں سے بھرا پڑا ہے۔ Sylviam Lavy کے مطابق، عیسوی سنہ سے صدیوں قبل، جنوبی ہند کے علاقوں اور مشرق بعید کے ممالک کے درمیان سرگرم تجارتی تعلقات قائم تھے۔ جنوبی ہندوستان کی ریاستوں کے حکمراں سمندروں پر اپنے تسلط کا دعویٰ کرتے تھے۔ مشرقی ہندوستان کے ساحل سے نوآبادکار، شری لنکا (Ceylon)، انڈونیشیا اور ملایا کا سفر کرتے تھے (یہاں تک کہ آج بھی ساترا کے مختلف قبائل میں اس قسم کے نام ملتے ہیں جیسے کہ چولا، پانڈیا، پلوا اور ملیلا)۔ دراصل، روم کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی تعلقات کے زوال کے ساتھ ہی جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی تعلقات میں اضافہ ہوا۔

عربوں کے منظر عام پر آنے سے قبل تک ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر ہندوستان کا تسلط تھا۔ یہاں تک کہ کھلے سمندروں پر عربوں کے غلبے کے بعد بھی عربوں اور ہندوستانی تاجروں کے درمیان تصادم بہت معمولی تھا، دونوں اپنی تجارت پرامن طریقے سے کر رہے تھے۔

سمندروں پر قبضہ کرنے یا بحری لڑائیوں کا خیال، بحر ہند میں بھی کسی کے دل میں نہیں پیدا ہوا، جیسا کہ کارتھیج (Carthage) اور روم کے درمیان ہوتا تھا۔ سلطان صلاح الدین کی سربراہی میں یروشلم پر عربوں کے قبضے کے بعد

● "Turning Points of Indian History" جناب مدن گوپال کی بے حد اہم کتاب ہے جس میں ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جنھوں نے ہندوستانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ "اردو دنیا" میں اس کا ترجمہ "ہندوستانی تاریخ کے اہم موڑ" کے نام سے قسط وار شائع کیا جارہا ہے۔

خاص طور سے سمندر پر عرب کا تسلط غالب ہوگیا تھا۔ اب وہ یورپ اور ایشیا کے درمیان ایک رکاوٹ بن گئے تھے۔

تقریباً 200 برسوں سے زیادہ عرصے تک عیسائیوں کی زبردست کوششوں کے باوجود، مصر اور شام پر عربوں کی حکومت جاری رہی۔ اس طرح یورپ میں ہندوستانی مسالوں کی درآمد مصر اور مشرقی بحیرۂ روم کے ذریعے ہوتی تھی۔ دراصل، کالی کٹ اور کنانور کے ہندوستانی سوداگروں نے قاہرہ اور بحیرۂ روم سے ملحقہ سبھی بندرگاہوں پر اپنے دفاتر اور مال گودام بنا رکھے تھے۔ ہندوستانی سوداگر مشرق بعید سے نہ صرف مسالوں بلکہ دیگر چیزوں کی تجارت بھی کرتے تھے۔ وہ انڈونیشیا اور ملیشیا کے عظیم بندرگاہوں کو ہندوستانی سوتی کی مصنوعات برآمد کرتے تھے اور بدلے میں مسالوں اور سلک وغیرہ کی درآمد کرتے تھے، جس سے نہ صرف یہ کہ ہندوستانی لوگوں کی ضروریات پوری ہوتی تھیں بلکہ دوبارہ انھیں بحیرۂ احمر اور خلیج فارس کے علاقوں میں برآمد کیا جاتا تھا تاکہ یورپ کی ضروریات پوری کی جاسکیں۔

تجارتی سامان بھجوانے والے نمائندے جو اس منافع بخش تجارت پر کنٹرول رکھتے تھے، ان اشیا جیسے کہ مرچ، مسالے اور سلک وغیرہ کی تجارتی گذرگاہوں پر رہنے والے معمولی ملکوں پر کافی اثر رکھتے تھے۔ جب مصر اور مشرقی بحیرۂ روم کے علاقوں میں موجود اسلامی طاقتوں نے ہندوستانی منڈیوں سے یورپ کے تسلط کو ختم کر دیا، اس وقت یورپی ممالک کو ہندوستان کے لیے دوسرے راستے تلاش کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ ان کا مقصد مسالوں کی تجارت کے ذرائع پر تسلط حاصل کرنا اور ان کی منڈیوں کو مشرقی بحیرۂ روم کے علاقوں سے مغربی یورپ میں منتقل کرنا تھا۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، ان کی ہندوستان کی یہی تلاش تھی جو کولمبس کو امریکا لے گئی اور جس نے واسکوڈی گاما کو ہندوستان پہنچا دیا۔

ہندوستان کو بحری راستے سے تلاش کرنے کا بیڑا سب سے پہلے وینس نے اٹھایا۔ اس کے فوراً بعد، کسی طرح، وینس کے قریبی دشمن جینوا نے، جو نہ صرف قابل بحریہ نورد تھے بلکہ شائق مہم جو بھی تھے، ان کی اتباع کی۔

جبکہ وینس کے باشندے محض مشرق بعید کے ذریعے ہونے والی تجارت پر اپنی اجارہ داری سے مطمئن تھے، جینوا نے خلیج فارس پر جنگی جہازوں کا ایک بیڑا قائم کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ بحراحمر میں داخلے پر قابو پایا جاسکے۔ جب اس سے تجارت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تو جینوا نے ہندوستان تک کا ایک سمندری راستہ تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا سبب تھا ایک ایسا راستہ جس سے مصر اور مشرق بعید میں موجود اسلامی طاقت اور وینس کی رکاوٹوں سے بچا جاسکے۔ اسی پیش رفت میں جینوا کے لوگ پرتگال اور اسپین کے بادشاہوں کے نمائندے بن گئے اور اس قانونی حق کی بنا پر انھوں نے افریقہ کے مغرب کے سمندروں کا سفر کیا۔ پرتگال کے پرنس ہنری (1394-1460) نے، جسے نیوی گیٹر (Navigator) کے نام سے جانا جاتا تھا، بحرنوردوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا اور ہندوستان کے لیے ایک سمندری راستے کی تلاش کے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے متعدد جغرافیہ دانوں کو بھی ملازم رکھا۔ یورپ سے ہندوستان تک ایک بحری راستے کی دریافت کے علاوہ، وہ مشرق میں عیسائیت کی تبلیغ کا بھی خواہاں تھا۔ اس کے خیال میں ہندوستان پہنچنے کا یہ منصوبہ خدا کا حکم تھا جو اسے دیا گیا تھا۔

بہرحال ہنری نیوی گیٹر کی حوصلہ افزائی کی بنا پر، پرتگالی بحرنورد افریقہ کے مغربی ساحل کو کھنگالنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ 1487 میں وہ Cape of Good Hope (راس امید جنوبی افریقہ کا صوبہ) پہنچ گئے۔

اس وقت یہ واقعہ یورپی بحرنوردوں کے لیے ایک بہت بڑے جشن کا موقع تھا۔ کیونکہ راس امید کے اس پار بحرہند اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ موجود تھا۔

دوسرے لفظوں میں وہ بحر ہند کو عبور کرنے کے لیے تیار تھے۔ اگلے دس برسوں کے اندر، یعنی 8/جولائی 1497 کو واسکوڈی گاما کی رہنمائی میں چار پرتگالی جہاز بحر ہند کے لیے روانہ ہوئے۔ راس امید سے اس نے افریقہ کے مشرقی ساحل کے ساتھ شمال کی جانب پیش قدمی کی۔ وہ بغیر کسی دشواری کے موزمبیق کے ساحل تک پہنچ گئے۔ پھر وہ مومباسا پہنچے۔ یہاں واسکوڈی گاما کو چار ہندوستانی جہاز نظر آئے۔ جب ہندوستانی جہازوں کا عملہ پرتگالی جہازوں پر سوار ہوا اور وہاں ایک چبوترے پر رکھی ہوئی حضرت مریم کی تصویر دیکھی تو انھوں نے خود کو دیوی کے روبرو پایا اور انھوں نے اس پر بھینٹ چڑھائی اور دعائیں مانگیں۔ واسکوڈی گاما نے سمجھا کہ یہ ہندوستانی لوگ جن کے جہازوں کو اس نے دیکھا تھا ضرور عیسائی ہوں گے۔ پھر وہ شمال کی جانب بڑھا۔ ملندی میں وہاں کے مقامی حکمراں نے واسکوڈی گاما کے جہازوں کی بحرہند میں رہنمائی کے لیے ایک ہندوستانی جہازراں کو اس کے ساتھ کر دیا جسے ہندوستانی جہازوں نے ہندوستان سے لے کر افریقہ کے مشرقی ساحلوں کے بندرگاہوں تک تجارت کے فروغ کے لیے رکھا ہوا تھا۔

27/مئی 1498 کو کالی کٹ کی سرزمین پر اس کا قدم رکھنا تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا، نہ صرف اس وجہ سے کہ اس نے یورپ سے ہندوستان تک ایک تجارتی راستہ قائم کیا بلکہ اس کے نتیجے میں بعد میں رونما ہونے والے

واقعات کی بنا پر اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔

واسکوڈی گاما کے سفر کے کا ایک مقصد عیسائیت کی تبلیغ کرنا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ہندوستانی بحرنوردوں سے ملاقات کے بعد اس کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگ عیسائی تھے، یا دوسرے لفظوں میں ہندوستان ایک عیسائی ملک تھا۔ اس طرح 1498 میں جب وہ کالی کٹ میں داخل ہوا تو اس نے غلطی سے ایک ہندو مندر کو کلیسا سمجھ لیا اور مندر میں رکھی ہوئی مورتی کو اس نے حضرت مریم کی مورتی سمجھا۔ مالا بار ساحل پر اپنے ابتدائی تین مہینوں کے قیام کے دوران وہ یہی سمجھتا رہا کہ وہ ایک عیسائی ملک میں ہے، اور اس نے مقامی حکمراں زمورین کی خدمت میں پرتگال کے بادشاہ کا سلام پہنچایا، (جیسا ایک عیسائی بادشاہ دوسرے کو پیش کرتا ہے)۔ پھر جب وہ پرتگال واپس پہنچا تو اس نے پرتگال کے عیسائی بادشاہ تک زمورین کا سلام پہنچایا۔ واسکوڈی گاما کی اس دریافت سے کہ ہندوستانی لوگ عیسائی تھے، اسے بے حد مسرت ہوئی۔ جس بات نے اسے اور اس کے درباریوں کو مایوس اور پریشان کیا، وہ یہ تھا کہ انھوں نے کالی کٹ میں دو مورو (شمالی مغربی افریقہ کے باشندے) کو دیکھا تھا جو Genoaese اور ہسپانوی زبان بولتے تھے۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے، زمورین کے دربار میں موروں کی تعداد اور ان کے رسوخ کو دیکھتے ہوئے واسکوڈی گاما کو فکر لاحق ہوئی۔ ان کی موجودگی، اور مزید یہ کہ تجارت پر ان کی اجارہ داری واسکوڈی گاما کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس نے زمورین سے کہا کہ وہ ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آیا ہے۔ زمورین نے اس کو خوش آمدید کہا اور اسے تمام سہولیات فراہم کیں لیکن پرتگالیوں نے اپنی جانب سے تمام مقامی اصولوں اور رواجوں کی پابندی کرنے سے انکار کر دیا۔

ہندوستانی اور عرب تاجروں کا ایک پرانا اصول کھلے سمندروں کی آزادی اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ صحت مند مسابقت تھا، واسکوڈی گاما نے ایک نیا اصول بنایا اور وہ اصول تھا سمندروں کی خودمختاری کا دعویٰ کرنے کے لیے وزنی ہتھیاروں کا استعمال۔ بھی سمندروں میں آزادانہ گھومنے کا عام اختیار، پرتگالیوں کے مطابق صرف یورپ کے پاس تھا۔ دوسرے لفظوں میں، یورپ سے باہر وہ کسی کی اجازت کے بغیر سامانوں کو ضبط کرنے کے مجاز تھے۔ انھوں نے کھلے سمندروں میں جعلسازی اور دہشت گردی کا آغاز کیا۔ وہ بغیر کسی اطلاع کے کسی بھی عرب یا ہندوستانی جہاز کو بیچ راستے میں روکتے، سامان خالی کرتے اور جہازوں میں آگ لگا دیتے۔ اس وقت صرف ایک غیر یورپی طاقت جس کے پاس ہتھیار تھے وہ تھی ترکی کی سلطنت عثمانیہ، لیکن ترکی کے پاس بحر ہند میں کوئی فوج نہیں تھی اور ترکوں کو یہ احساس اس وقت ہوا جب پرتگالیوں نے بحر ہند میں اپنے قدم جما لیے تھے۔

واسکوڈی گاما ہندوستان کے اپنے پہلے سفر کے بعد دوبارہ بڑی طاقت کے ساتھ آیا۔ چار جہازوں کی بجائے اس مرتبہ اس کے پاس تیس جہاز تھے جو پوری طرح بندوقوں اور توپوں سے لیس تھے۔ اس مرتبہ اس کے آدمیوں کی تعداد 1500 تھی۔ تیس جہازوں میں سے چھ جہاز ہندوستان پہنچے۔ اس کی ماتحتی میں کثیر بحری اور فوجی طاقت کے ساتھ پرتگالیوں نے اپنے ارادے ظاہر کر دیے تھے۔ انھوں نے محصول کی ادائگی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے وقت سے پہلے مشکلیں پیدا ہو گئیں۔ کالی کٹ کے زمورین اور اس کے بحر احمر کے سوداگر ساتھی کھوجا امبر نے اپنی فوجوں کو جمع کیا جو واسکوڈی گاما کی فوجوں سے زیادہ تھیں۔ مقابلہ ہوا لیکن واسکوڈی گاما بیچ میں ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ زمورین کی فوجیں مطمئن ہو گئیں۔ انھوں نے پرتگالیوں کا تعاقب نہیں کیا۔ یہ ان کے لیے خودکشی ثابت ہوئی، کیونکہ پرتگالی دوبارہ واپس آئے اور 1503 میں کوچین میں ہونے والی لڑائی میں انھوں نے زبردست فتح حاصل کی۔

1509 میں مصری فوجوں کی شکست سے پرتگالیوں کو سمندر پر مکمل بالادستی حاصل ہو گئی۔ پرتگالیوں نے اب الفانسوڈی البقرق، جو مشرق میں 1509 سے 1515 تک پرتگال کا گورنر تھا، کی رہنمائی میں نیا منصوبہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ البقرق نے 1509 میں خلیج فارس کے شمال میں ہرمز پر قبضہ کیا۔ اس سے اگلے برس اس نے گوا کو بیجاپور کے سلطان کے ہاتھوں سے چھین لیا۔

1511 میں اس نے زبردست جنگ کے بعد ملاکا پر قبضہ کیا جو مشرقی ایشیا کا عظیم تجارتی مرکز تھا۔

اس طرح واسکوڈی گاما کے کالی کٹ پہنچنے کے پندرہ برسوں کے اندر پرتگالیوں نے ہندوستانی اور غیر ممالک کے درمیان تمام سمندری راستوں کو بند کر دیا اور بحر ہند پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ ہندوستانی تجارت پر ان کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ سمندروں پر ان کا غلبہ ہو گیا اور انھوں نے دوسروں کو جو تجارت یا جہازی سفر کا دعویٰ کرتے تھے، باہر نکال دیا۔ جب ہالینڈ نے پرتگال کے حفاظتی انتظام میں رخنہ ڈالا اور ملاکا کو فتح کر لیا تو بحر ہند پر پرتگالیوں کا اختیار ختم ہو گیا اور اس نے عظیم بحری قوت والی ممالک کی مسابقت کے لیے راہ ہموار کی جو اس وقت ابھر رہی تھیں جیسے برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ۔

اس کے نتیجے میں سب سے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ انھوں نے جنوبی ہند کے ریاستی امور میں بھی اپنی مداخلت شروع کر دی۔

اظہار احمد ندیم

شمیم حنفی سے گفتگو

پروفیسر شمیم حنفی عصرِ حاضر کے اہم نقاد اور ادیب ہیں۔ ان کی پیدائش 17/نومبر 1938 کو سلطانپور (اترپردیش) میں ہوئی۔ انہوں نے پروفیسر احتشام حسین کی نگرانی میں ڈی.فل. اور پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں ڈی.لٹ کیا۔ ابتدا میں آپ نے اندور یونیورسٹی کے ملحقہ ایک کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ بعدازاں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوگئے۔ موصوف نے صدر شعبہ کے علاوہ ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگویجز کی ذمّے داریاں بھی بحسن و خوبی انجام دیں اور 2004 میں سبک دوش ہوئے۔ ان دنوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اکیڈمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز میں وزیٹنگ پروفیسر ہیں۔

پروفیسر شمیم حنفی کی ادبی دل چسپیوں کا دائرہ وسیع ہے۔انہوں نے بچوں کے لیے ادیبوں کی سوانح عمریاں اور پری کتھائیں تحریر کی ہیں۔ان کے ڈراموں کے چار مجموعے "مٹی کا بلاوا"، "مجھے گھر یاد آتا ہے"، "زندگی کی طرف"، "بازار میں نیند" شائع ہو چکے ہیں۔ "جدیدیت کی فلسفیانہ اساس" اور "نئی شعری روایت" ان کی تنقیدی کتابیں ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی نے ابوالکلام آزاد کی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" کا ترجمہ اردو میں "ہماری آزادی" اور پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب Early writings: Years of Struggle کا ترجمہ "جدوجہد کے سال" کے نام سے کیا ہے۔ انہوں نے "فراق: شخص اور شاعر"، "فراق دیارِ شب کا مسافر" اور "سیاہ فام ادب" کے نام سے کتابیں ترتیب دی ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی سے کی گئی گفتگو قارئین "اردو دنیا" کی نذر ہے۔

سوال: موجودہ دور میں انسان کی ترجیحات بدلتی جارہی ہیں ایسے میں مطالعے کا شوق کس حد تک باقی رہ پائے گا؟

جواب: جس کو پڑھنا ہے وہ پڑھے گا، جس کو نہیں پڑھنا ہے وہ مختصر سی تحریر بھی نہیں پڑھے گا۔ لیکن میرے لیے یہ مسئلہ ہے کہ آنے والی صدیوں میں ادب کا کیا حال ہوگا؟ ادب میں کس حد تک اپنا وجود برقرار رکھنے کی قوت رہ جائے گی۔ جس طرح کا Infotech معاشرہ بنتا جارہا ہے بلکہ بن چکا ہے اس میں تخلیقی لفظ کی کیا قدر و قیمت باقی رہے گی، یہ زیادہ سوچنے کی بات ہے۔

میں نے مارکیز کا ایک انٹرویو پڑھا تھا اس میں اس نے یہ کہا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہوجائے، مشینیں چاہے جتنی ترقی کرلیں اور دنیا میں جتنے بھی تجربے کرلیے جائیں لیکن تخلیقی لفظ اور کتاب کی قدر و قیمت ہمیشہ باقی رہے گی۔ یعنی کتاب پڑھنے کا جو لطف ہے اس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ آپ کوئی بھی سیریل یا فلم دیکھیں اور جب وہی چیز آپ کسی کتاب یا رسالے میں پڑھتے ہیں تو اس کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ چھپے ہوئے لفظ میں ایک عجیب و غریب جادو ہوتا ہے۔ تخلیقی لفظ کے بارے میں میرا اپنا خیال ہے کہ دنیا چاہے جتنی بدل جائے لیکن جب تک تخلیقی اعتبار سے انسان کی حسیں بیدار رہیں گی تب تک ادب میں دلچسپیاں باقی رہیں گی اور ادب کا اعتراف کیا جاتا رہے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر زمانے میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے کبھی کسی صنف کو زیادہ قبولیت مل جاتی ہے کبھی کسی خاص علاقے میں کوئی ایک صنف مقبول ہوجاتی ہے۔ اس کے اپنے تہذیبی اور معاشرتی اسباب ہوتے ہیں۔

سوال: عصرِ حاضر میں جب ہر شے کو سودوزیاں کے میزان پر تولا جارہا ہے کیا ایسی صورت میں ادب زندہ رہ پائے گا؟

جواب: رشید احمد صدیقی کہا کرتے تھے کہ "مہذب انسانوں کو نفع کے

نقصان کا اور نقصان کے نفع کا اندازہ ہونا چاہیے۔'' یہی تہذیب کی پہچان ہوتی ہے۔ آپ یہ سوچیں کہ ہمارے لیے کارآمد چیز کیا ہے؟ میں چند دنوں قبل ''دی ہندو'' میں آئنسٹائن کے بارے میں ایک مضمون پڑھ رہا تھا اس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ ہمارے لیے Man of Value زیادہ قیمتی ہے بہ نسبت Man of success کے۔ ہر زمانے میں اور ہمارے زمانے میں بھی آپ کو بے شمار کامیاب لوگ نظر آجائیں گے۔ بزنس کرنے والے لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ غالب اور میر اپنے زمانے کے کامیاب ترین آدمی نہیں تھے۔ آج ہمارے دور کے اچھے لکھنے والے مثلاً انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، نیر مسعود وغیرہ ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی پر نظر ڈالیں تو ان سے کامیاب لوگ آپ کے معاشرے میں مل جائیں گے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ادب ہو یا زندگی کے دوسرے معاملات، ہر جگہ آخری فیصلہ اخلاقی بنیادوں پر ہوتا ہے۔

لوگوں نے ادب کو بھی کاروبار بنا دیا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار میرٹ پروموشن اسکیم کے تحت اردو کے کچھ اساتذہ کی ترقی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے بستی حضرت نظام الدین میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ گجرات کے سابق گورنر پروفیسر سروپ سنگھ جلسے کی صدارت کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہر زبان میں، ہر مضمون میں پروفیسر ہوتے ہیں لیکن کہیں بھی جلسہ نہیں ہوتا، یہ اردو والوں کو کیا ہوگیا ہے؟ ایسا لگ رہا ہے کوئی انہونی بات ہوگئی ہے۔ اردو والوں کو کوئی چھوٹا سے چھوٹا اعزاز مل جائے تو اردو اخبارات کے صفحات اس کے ذکر سے بھرے نظر آتے ہیں۔

سوال: اردو شاعری کے ہر دور میں نمائندہ شاعر موجود رہے ہیں۔ عہد حاضر میں ایسے نام ابھر کر نہیں آرہے ہیں جنھیں ہم اس دور کے نمائندہ شاعروں کے خانے میں شامل کرسکیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟

جواب: دیکھیے آپ کے سوال کا جواب ہاں بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ ایک تو آپ نے یہ کہا کہ ہر دور میں نمائندہ شاعر رہے ہیں تو ہمارے دور میں بھی ہوں گے۔ یعنی ہر دور میں خراب شاعروں کی بھیڑ رہی ہے تو ہمارے دور میں بھی ہے۔ مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعری کے لیے گذشتہ زمانہ شاید زیادہ سازگار تھا۔ اب شاعری کے مقابلے میں پوری دنیا میں لوگ فکشن زیادہ توجہ سے پڑھ رہے ہیں اور فکشن زیادہ لکھا بھی جارہا ہے۔ شاعری سے لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے۔

لیکن ایسا نہیں کہ ہمارے زمانے میں اچھے شاعروں کی کمی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں اچھے شاعروں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ایک بات میں صاف طور سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں ادب کے حوالے سے دونوں ملکوں کی تقسیم نہیں کرتا۔ ہمارے زمانے میں منیر نیازی ہیں، ظفر اقبال ہیں، احمد مشتاق ہیں، ساقی فاروقی ہیں، شہریار ہیں، بلراج کومل ہیں، باقر مہدی ہیں اور من موہن تلخ تھے، قاضی سلیم تھے عرفان صدیقی تھے۔ یہ بھی اچھے شاعر ہیں۔ حال ہی میں، میں نے پاکستان کے کچھ شعری مجموعے دیکھے جن میں عرفان ستار، اکبر احمد معصوم وغیرہ کی شاعری مجھے اچھی لگی۔ اس کے علاوہ نثری نظموں میں افضال احمد سید، ذیشان ساحل، ارباب مصطفی، سعید الدین ہیں۔ خواتین میں تنویر انجم، وسیم الدین ہئی وغیرہ بہت اچھی نظمیں کہہ رہی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں بھی شاعری کے نئے میلانات کی نمائندگی کرنے والوں اور اچھے شاعروں کی بھی کمی نہیں ہے۔ البتہ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے خراب شاعروں کا تناسب اچھے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ مشفق خواجہ مرحوم کہا کرتے تھے کہ تذکروں میں ہمیں جن شعرا کا ذکر ملتا ہے ظاہر ہے بہت سے ایسے شعرا جو گمنام رہ گئے جن کا ذکر ہم تک نہیں پہنچا ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

سوال: آپ نے اپنی گفتگو میں کہا کہ اس وقت پوری دنیا میں فکشن زیادہ لکھا جارہا ہے۔ اردو میں موجودہ فکشن کی کیا صورت حال ہے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ اردو میں بہت اچھا فکشن لکھا جارہا ہے۔ میں عمر کے حساب سے ادیبوں کو نہیں پڑھتا۔ سید محمد اشرف، سلام بن رزاق، خالد جاوید اور طارق چھتاری وغیرہ اچھا لکھتے ہیں۔ نیر مسعود کا ایک افسانہ ماہنامہ ''شب خون'' میں ''مسکینوں کا کمرہ'' پڑھا تھا اس کا اثر کئی دنوں تک مجھ پر رہا۔ خالد جاوید کی ایک کہانی ''تفریح کی ایک دوپہر'' پڑھی وہ مجھے اچھی لگی۔ میں اچھی تحریریں پڑھنے کا قائل ہوں اور میں نئی نسل اور پرانی نسل کو الگ الگ کرکے نہیں پڑھتا۔

سوال: اردو ڈرامے کے ساتھ ہمیشہ سے ہی سوتیلا سلوک کیا جاتا رہا ہے اور ان دنوں بھی وہی سلوک روا ہے۔ آپ اس سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟

جواب: ادب کا سوشل رول جس طرح ڈراما ادا کرسکتا ہے اس قدر ادب

کی کوئی صنف ادا نہیں کر سکتی۔ لیکن ڈرامے پر ہمیں جتنی توجہ دینی چاہیے تھی اتنی نہیں دی گئی۔ مخمور سعیدی اور انیس اعظمی نے مل کر ایک کتاب "اردو تھیٹر: کل اور آج" ترتیب دی تھی۔ اس کو دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ ڈرامے کا ماضی اتنا کمزور نہیں تھا جتنا عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں۔ ہمارے یہاں ڈرامے تو بہت لکھے گئے لیکن اسٹیج اس طرح ترقی نہیں کر سکا۔ ڈرامے کی ترقی کا بہت کچھ دارومدار اسٹیج کی ترقی پر ہوتا ہے۔

حبیب تنویر اردو ڈرامے کے ہی نہیں بلکہ ہندوستانی ڈرامے کے icon بن چکے ہیں۔ جب ہم ہندوستانی ڈرامے کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی ایک الگ سی تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ میرے دل میں ان کی غیر معمولی عزت ہے۔ ان کے بہت سارے ڈرامے مثلاً آگرہ بازار، جمعہ دارنی، مٹی کی گاڑی اور بونگا پنڈت میں نے دیکھے ہیں۔

دہلی کے اردو ڈراموں میں شاہد انور، انیس اعظمی اپنے اپنے طور پر محنت کر رہے ہیں۔ حال ہی میں شاہد انور کے ڈراموں کا ایک مجموعہ "غیر ضروری لوگ" کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ "غیر ضروری لوگ" ڈراما میں نے دیکھا بھی ہے جو منٹو کے نمائندہ کرداروں کا ایک تانا بانا بن کر تحریر کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے کو ساہتیہ کلا پریشد نے سال کے بہترین ڈرامے کے ایوارڈ سے نوازا ہے۔ عزیز قریشی کے بھی ڈرامے میں نے دیکھے ہیں۔ مغربی بنگال میں ظہیر انور اردو ڈرامے کے لیے سرگرم ہیں۔

اردو ڈراموں کو بنگلہ، مراٹھی، کنڑ، ہندی وغیرہ ڈراموں کی طرح سرپرستی حاصل نہیں رہی یہ اردو ڈرامے کے ترقی نہ کرنے کی ایک اہم وجہ ہے۔ ہماری تہذیب میں مشاعرہ بہت حاوی رہا۔ اس نے باقی اصناف میں لوگوں کی دلچسپی کو کم کر دیا۔

سوال: آج جو تنقید لکھی جارہی ہے اس کا معیار کیا ہے؟

جواب: آج بہت اچھی تنقید لکھی جارہی ہے۔ علم کا دائرہ وسیع ہوا ہے، پڑھنے پڑھانے کا شوق بڑھا ہے۔ حال ہی میں، میں نے قاضی جمال حسین کے مضامین پڑھے ہیں، مجھے بہت اچھے لگے۔ قاضی افضال حسین کا مضمون دریدا پر بہت اچھا لگا۔ ابوالکلام قاسمی کے مضامین کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ایک شخص اپنی روایت سے باخبر ہے اور آج کی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا بھی اسے شعور ہے۔

لیکن اس طرح کی تنقیدی تحریریں بھی لکھی جارہی ہیں جن کو پڑھنے کے بعد مجھے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ مزاحیہ ہے یا سنجیدہ ہے۔ مثلاً کسی نے ایک شخصیت کا ذکر کرنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ اس شخصیت میں ساری جہات نظر آرہی ہیں۔ ادب کی تنقید کا یہ عمل نہیں ہے۔

ہمارے زمانے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ لوگ دعوت دے کر، فرمائش کر کے اپنے بارے میں لکھواتے ہیں اور ایسی تحریروں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ اس لیے کہ اب لوگ ڈھیٹ اور بے غیرت زیادہ ہوگئے ہیں۔ احتشام حسین اور آل احمد سرور ہمارے استاد تھے۔ ان لوگوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم پر لکھا جائے یا کسی رسالے کا خصوصی شمارہ شائع کیا جائے۔ حالی، شبلی، کلیم الدین احمد نے خاموشی سے اپنا کام کیا۔

سوال: عہد حاضر کے شاعروں اور ادیبوں میں کسی رویے، رجحان اور تحریک کا کس حد تک عمل دخل ہے؟

جواب: رویہ، رجحان اور تحریک لکھنے والا بناتا ہے کوئی نقاد نہیں بناتا۔ ہمارے زمانے کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ لوگ توقع کرتے ہیں کہ تنقید یہ بتائے کہ یہ لکھیں یا وہ لکھیں۔ بھئی! غالب نے کس سے پوچھ کر شعر کہے تھے، اقبال نے کس نقاد سے پوچھا تھا کہ کیسی نظم کہنی چاہیے، پریم چند نے کس سے پوچھا تھا کہ کیسا افسانہ لکھنا چاہیے۔ رجحان ساز تو تخلیق کار ہوتا ہے۔ ایسے نقاد کتنے کے ہوئے ہیں جن سے واقعی تخلیق کاروں نے بڑا اثر قبول کیا ہو۔

سوال: آج کل یہ کہا جارہا ہے کہ ہم مابعد جدید دور میں جی رہے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: مابعد جدید رویے تو مغرب میں بہت پہلے عام ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ہمارے یہاں کچھ دنوں سے اس کا چرچا ہو رہا ہے۔ اگر پوری دنیا کو ایک اکائی سمجھیں تو ہم مابعد جدید دور میں جی رہے ہیں۔

اصطلاحوں کے اس کھیل کا ادب سے بہت زیادہ تعلق نہیں ہے۔ جس زمانے میں جدیدیت کو ہمارے ملک میں عام کیا گیا اس کے اتنے ہی ابعاد (Dimensions) پوری دنیا میں تھے؟ ہمارے ملک میں جدیدیت کی کچھ باتوں پر زور دیا گیا اور کچھ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ہمارے یہاں مابعد جدید فکر والے جو باتیں کہتے ہیں اس کے بارے میں جدید فکر والے بہت پہلے کہہ چکے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی کہا ہے کہ سچی تخلیقی بصیرت والے لوگ یہ نہیں دیکھیں گے کہ آج کون سا رجحان چل رہا ہے۔ وہ اپنی پسند کے مطابق لکھتے ہیں۔

سوال: اردو تحقیق پر بہت کم توجہ دی جارہی ہے۔ اس کی کیا وجوہات ہیں؟

جواب: پی.ایچ.ڈی. کی تحقیق کا معیار دن بہ دن گرتا جارہا ہے۔ اس لیے کہ اسے کیریئر سے جوڑ دیا گیا ہے۔ ہر کوئی جلدی میں ہے کہ اسے ملازمت حاصل کرنی ہے۔ ایسے میں معیار کا خراب ہونا فطری ہے۔ ان دنوں طالب علموں میں پڑھنے کا شوق کم دکھائی دیتا ہے۔

جب میں طالب علم تھا تو کوئی بھی نیا رسالہ یا نئی کتاب آتی تھی تو اس کا ذکر ہمارے اساتذہ کلاس میں ضرور کرتے تھے لیکن ان دنوں ایسا نہیں ہوتا۔ دس سال پرانی کسی کتاب کا نام لیجیے تو بعض دفعہ اساتذہ بھی چونک جاتے ہیں کہ یہ کون سی کتاب ہے اور کب چھپی ہے۔

ہمارے یہاں زندہ لوگوں پر کام کرنے کا رواج بھی زور پکڑتا جارہا ہے۔ میرا خیال ہے کسی بھی زندہ ادیب پر کام نہیں ہونا چاہیے تاوقتیکہ وہ اپنا سارا کام کرچکا ہو اور اس کی گنجائش نہ رہ گئی ہو کہ وہ مزید کوئی کام کرے گا۔ میں نے یہاں تک سنا ہے کہ جن زندہ لوگوں پر تحقیق ہوتی ہے وہ ان ریسرچ اسکالروں کو اپنے گھروں میں ٹھہراتے ہیں، ڈکٹیٹ کرتے ہیں۔ یہ بہت ہی پست درجے کی بات ہے۔ میں نے بعض ایسے لوگوں پر بھی تحقیق کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ ان صاحب کو ان کے محلے اور گاؤں کے لوگ تو جانتے ہیں مگر باہر کوئی نہیں جانتا۔

سوال: ان دنوں اردو میں بہت زیادہ کتابیں شائع ہورہی ہیں مگر ادب سے قاری کا رشتہ ٹوٹتا جارہا ہے۔ ایسا کیوں؟

جواب: اس کا ایک سبب تو مجھے یہ لگتا ہے کہ ان دنوں کثرت سے جو کتابیں چھپ رہی ہیں وہ کتابیں لوگوں کو پڑھنے سے بیزار کررہی ہیں۔ لیکن سچائی یہ بھی ہے کہ ان دنوں جو کتابیں چھپ رہی ہیں ان میں اکثریت ان کی ہے جو نہیں پڑھی جاتیں۔ اب کتابیں مفت لینے والے بھی نہیں ملتے۔ بعض ایسی کتابیں چھپتی ہیں جن کے بارے میں مجھے معلوم نہیں کہ ان کے پڑھنے والے کہاں پائے جاتے ہیں۔

سوال: اردو زبان کے مسائل کے حل کے لیے آپ کے کیا مشورے ہیں؟

جواب: میں مشورے کسی کو نہیں دیتا۔ البتہ میں سوچتا ضرور ہوں کہ اردو کی ترقی کے لیے کون کون سے اقدامات ضروری ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی زبان سرکاری سرپرستی اور روزگار سے جڑ جانے کی بنا پر ترقی نہیں کرسکتی۔ زبانیں زندہ رہتی ہیں اس زبان کے بولنے والوں کی اپنی دلچسپی اور کمٹمنٹ پر۔ میرا خیال ہے کہ کبھی ہمیں اردو کے مسئلے کو اس روشنی میں بھی دیکھنا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ اردو کے خلاف تعصب برتا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ آزادی کے بعد سے ہی یہ سلسلہ چل رہا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اردو کو بہت ہی منصوبہ بند طریقے سے ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ رمیش تھاپر نے انگریزی رسالہ "سیمینار" کا ایک خصوصی گوشہ اسی پر نکالا تھا کہ زبانوں کو رفتہ رفتہ کس طرح قتل کیا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ بھی ہے کہ اردو والوں نے اردو کے لیے کیا کیا۔ اردو کو روزگار سے نہیں جوڑا گیا جس کے سبب اردو کی ترویج و اشاعت متاثر ہوئی۔ یہ ایک وجہ ہے ساری وجوہات نہیں۔

سوال: حکومت دہلی نے حال ہی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے۔ ہمیں اس قدم سے کون کون سی توقعات کرنی چاہئیں؟

جواب: حکومت دہلی نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے یہ بہت ہی خوش آئند بات ہے۔ ہمیں یہ توقع کرنی چاہیے کہ حکومت دہلی نے نہ صرف اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے بلکہ وہ اردو کے ساتھ انصاف بھی کرے گی۔

سوال: آج کل آپ کون کون سے تنقیدی و تخلیقی کام کررہے ہیں؟

جواب: حال ہی میں انجمن ترقی اردو (ہند) سے میری ایک کتاب "ہمسفروں کے درمیان" کے نام سے چھپی ہے جس میں معاصر ادیبوں پر مضامین ہیں۔ دوسری کتاب "محفل ہم نفساں" جلد ہی منظر عام پر آئے گی اور تیسری کتاب "کارگہ شیشہ گراں" بھی انجمن ترقی اردو (ہند) سے چھپے گی۔ تیسری کتاب میں بالکل نئے لکھنے والوں پر مضامین شامل ہیں۔ ایک چھوٹی کتاب منٹو پر لکھ رہا ہوں۔ محمد حسین آزاد پر ایک کتاب کا مسودہ میرے پاس ہے جس پر نظر ثانی کررہا ہوں۔ غالب پر بھی ایک کتاب جلد ہی آنے والی ہے۔

سوال: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی خدمات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اردو کے فعال اداروں میں سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بھی ایک ہے جو اردو زبان کے لیے معروف عمل ہے۔ لیکن کونسل کو قصبات، دیہات کے ان لوگوں کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے جو دور دراز کے علاقوں میں رہتے ہیں۔

□□□

منیب الرحمٰن

یہ گھر

یہ گھر جو بنائے تھے تم نے
اک روز بڑے ارمانوں سے
سکھ چین سے ان میں رہنے کو
ہر ڈھنگ کا ساز و ساماں تھا
ہر رنگ کی زیب و زینت تھی
کس شوق سے، کس رغبت سے یہاں
یہ باغ لگائے تھے تم نے
محنت کا پسینہ دے دے کر
یہ پھول کھلائے تھے تم نے
سوچا تھا بڑھاپا آئے گا
تم شادی و راحت پاؤ گے
اولاد کی قربت و صحبت سے
گزریں گے تمھارے باقی دن
بے فکری اور فراغت سے
اب چھوڑ کے تم کو سب بچے
پردیس سمندر پار گئے
آرام و خوشی کی خواہش میں
وہ جیت گئے، تم ہار گئے

یہ گھر جو بنائے تھے تم نے
تم ان میں اکیلے رہتے ہو
اک روز یہاں مر جاؤ گے
بچے نہ پلٹ کر آئیں گے
اس روز یہ گھر مر جائیں گے

منتر

(1)

شام کا وقت تھا، ڈاکٹر چڈھا گولف کھیلنے جا رہے تھے، موٹر دروازے کے سامنے کھڑی تھی کہ دو کہار ڈولی لیے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ڈولی کے پیچھے ایک بوڑھا نحیف آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ڈولی مطب کے سامنے آ کر رک گئی۔ بوڑھے نے دھیرے دھیرے دروازے پر آ کر اندر جھانکا، ایسی صاف ستھری زمین پر اسے پیر رکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چلا نہ دوڑے۔

ڈاکٹر صاحب نے چق کے اندر سے گرج کر کہا، ''کون ہے کیا چاہتا ہے؟''

بوڑھے نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ''ہجور بڑا گریب آدمی ہوں۔ میرا لڑکا کئی دن سے......''

ڈاکٹر نے سگار جلاتے ہوئے کہا۔ ''کل سویرے آؤ۔ سویرے۔ ہم اس وقت مریضوں کو نہیں دیکھتے۔''

بوڑھے نے گھٹنے ٹیک کر زمین پر سر رکھ دیا اور بولا۔ ''دہائی ہے سرکار کی، ہجور لڑکا مر جائے گا۔ چار دن سے آنکھیں......''

ڈاکٹر نے کلائی پر نظر ڈالی، چھ بجنے میں صرف 10 منٹ باقی تھے۔ گولف اسٹک ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے، ''کل سویرے آؤ، ہم کھیلنے جاتا ہے۔''

بوڑھے نے پگڑی اتار کر چوکھٹ پر رکھ دی اور رو کر بولا، ''ہجور ایک نگاہ دیکھ لیں، لڑکا ہاتھ سے چلا جائے گا۔ سات لڑکوں میں یہی ایک بچ رہا ہے ہجور۔ ہم دونوں آدمی رو رو کر مر جائیں گے۔''

ڈاکٹر نے چلمن اٹھائی اور موٹر کی طرف چلے، بوڑھا پیچھے پیچھے یہ کہتا ہوا دوڑا۔ ''سرکار بڑا دھرم ہوگا، ہجور دیا کیجیے۔ مگر ڈاکٹر صاحب مطلق مخاطب نہ ہوئے۔ موٹر پر بیٹھ کر بولے۔ کہہ دیا کل سویرے آؤ۔''

موٹر چلی گئی، بوڑھا کئی منٹ تک سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ دنیا میں ایسے انسان بھی ہوتے ہیں، اسے اب بھی یقین نہ آتا تھا۔ پھر اس نے کہاروں سے ڈولی اٹھانے کو کہا۔ یہ غریب چاروں طرف سے مایوس ہو کر چڈھا کے پاس آیا تھا، ان کی بڑی تعریف سنی تھی، یہاں سے جواب پا کر پھر وہ اور کسی ڈاکٹر کے پاس نہ گیا، قسمت ٹھونک لی۔ اسی رات کو اس کا سات سال کا ہنستا کھیلتا بچہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بوڑھے ماں باپ ہاتھ مل کر رہ گئے۔ زندگی کا یہی ایک سہارا تھا، اسی بچے کا منہ دیکھ کر دونوں جیتے تھے، اب دنیا ان کے لیے تاریک ہو گئی!

(2)

کئی سال گزر گئے، ڈاکٹر چڈھا کی ثروت اور شہرت ماہ نو کی طرح بڑھتی گئی اور صحت تو ان کی بے مثال تھی۔ یہ ان کی پابندی اوقات کا نتیجہ تھا کہ پچاس سال کے سن میں بھی ان کی چستی و جفاکشی جوانوں کو شرمندہ کرتی تھی، اکثر لوگ صحت کے قواعد کی پابندی اس وقت کرتے ہیں جب صحت زائل ہو چکی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر چڈھا علاج اور انسداد کے راز کو خوب سمجھتے تھے۔ ورنہ ڈاکٹر ہی کیوں ہوتے۔ تعین اولاد بھی انھی قواعد میں تھا۔ ان کے صرف دو لڑکے ہوئے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ تیسری اولاد نہ ہوئی۔ چنانچہ شریمتی چڈھا کی صحت میں بھی کسی قسم کا ضعف نہ تھا۔ دونوں لڑکے صحت اور زندہ دلی کے پتلے تھے۔ لڑکی کی تو شادی ہو چکی تھی، لڑکا کالج میں پڑھ رہا تھا۔ سبزہ آغاز نوجوان تھا، مردانہ حسن کا اعجاز، ذہانت کا پتلا، تحریر و تقریر میں یونیورسٹی کا مایۂ ناز۔ چہرہ سے نور برستا تھا۔ ہر ایک دائرہ کا مرکز نگاہ، خوش گلو، خلیق، منکسر، آج اس کی بیسویں سالگرہ تھی۔

رات کا وقت تھا، ہری ہری گھاس پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، شہر کے رؤسا اور حکام ایک طرف، کالج کے طلبہ دوسری طرف بیٹھے ہوئے دعوت کھا رہے تھے۔ بجلی کی روشنی سے سارا میدان برق قائم بنا ہوا تھا۔ تفریح کے سامان بھی جمع تھے، ایک چھوٹے سے فارس کھیلنے کی تیاری کی گئی تھی۔ فارس خود نوجوان چڈھا کی تصنیف تھی، وہی خاص ایکٹر بھی تھا، وہ اس وقت ایک ریشمی

● اردو فکشن کے بنیادگزاروں میں منشی پریم چند کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے ناول اور مختصر افسانے کی اصناف کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ انھیں وقار اور اعتبار بھی بخشا۔ منشی پریم چند کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز اردو سے ہوا تھا، پھر وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے اور وہاں بھی اپنے عہد کی سب سے بڑی ادبی شخصیت کہلائے۔ کونسل نے پریم چند کی تمام تحریریں اس کلیات میں مجتمع کر دی ہیں جو 24 جلدوں پر مشتمل ہے جسے ممتاز ماہر پریم چند مدن گوپال نے مرتب کیا ہے۔ 24 جلدوں کی قیمت -/4011 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

کرتا پہنے، ننگے پاؤں، دوستوں کی خاطر و مدارات میں مصروف تھا۔ کوئی پکارتا چڑھا ذرا ادھر آنا، کوئی ادھر سے پکارتا، چڑھا کیا ادھر ہی رہوگے؟

یکا یک ایک حسینہ نے آ کر کہا۔ ''کیوں کیلاش، تمھارے سانپ کہاں ہیں، ذرا مجھے بھی دکھادو۔''

چڑھا نے ٹالتے ہوئے کہا ''اس وقت معاف کرو مرنالنی، کل دکھادوں گا۔''

مرنالنی نے ایک انداز سے ماتھا سکوڑ کر کہا، ''جی نہیں تمھیں دکھانا پڑے گا، میں نہیں ماننے کی، تم یوں ہی روز کل کل کرتے رہتے ہو۔''

مرنالنی اور کیلاش دونوں ہم جماعت تھے، اور ایک دوسرے پر فدا، کیلاش کو سانپوں کو نچانے اور کھلانے کا شوق تھا۔ طرح طرح کے سانپ پال رکھے تھے، ان کے عادات و خواص کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ سانپوں پر تھوڑے دن ہوئے اس نے یونیورسٹی کلب میں ایک نہایت دلچسپ تقریر کی تھی، اور سانپوں کو نچا کر دکھایا تھا۔ ایک بوڑھے سپیرے سے اس نے یہ فن سیکھا تھا، سانپوں کی کتنی ہی جڑی بوٹیاں اس نے جمع کر رکھی تھیں۔ مرنالنی کا اصرار بے موقع تھا۔ سانپوں کے کمرے میں بہت ہجوم ہوجائے گا۔ اس لیے وہ ٹال رہا تھا اور شاید مرنالنی مان بھی جاتی، مگر دوستوں کو چین کہاں؟ ایک صاحب بولے، دکھا کیوں نہیں دیتے بھئی، ایک ذرا سی بات کے لیے اتنا ٹال مٹول کررہے ہو، مرنالنی ہرگز نہ ماننا، دیکھوں یہ حضرت کیسے نہیں دکھاتے۔ دوسرے صاحب بولے۔ مس مرنالنی اس قدر سیدھی اور بھولی ہیں جبھی آپ اتنا مزاج کرتے ہیں، دوسری ہوتی تو اسی بات پر بگڑ کھڑی ہوتی۔ تیسرے صاحب نے فرمایا اجی بولنا چھوڑ دیتی، صورت نہ دیکھتی، اس پر آپ کو دعویٰ ہے کہ مس مرنالنی کے لیے جان حاضر ہے۔

مرنالنی نے ان شہدوں کی طرف تمسخر کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا، آپ لوگ میری وکالت نہ کریں، میں اس وقت نہیں دیکھنا چاہتی، چلو چھٹی ہوئی۔

اس پر دوستوں نے قہقہہ لگایا، ایک صاحب بولے، دیکھنا تو آپ سب چاہیں لیکن کوئی دکھائے بھی۔

کیلاش کو مرنالنی کے بشرے سے معلوم ہوا کہ اس وقت اس کا انکار ناگوار گذرا۔ جوں ہی دعوت ختم ہوئی اور گانا شروع ہوا اس نے مرنالنی اور چند احباب کو سانپوں کے دربے کے سامنے لے جا کر مہور بجانا شروع کیا۔ پھر ہر ایک خانے کو کھول کھول کر ایک ایک سانپ نکالنے لگا۔ واہ! کیا کمال تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کیڑے اس کی ایک ایک بات کو سمجھتے ہیں۔ کسی کو ہاتھوں میں اٹھالیا، کسی کو گردن میں ڈال لیا، کسی کو ماتھے کے گرد لپیٹ لیا، مرنالنی بار بار منع کرتی تھی، انھیں گردن میں نہ ڈالو۔ دور ہی سے دکھادو۔ بس ذرا نچادو۔ کیلاش کی گردن میں سانپوں کو لپٹتے دیکھ کر اس کی جان نکلی جاتی تھی۔ افسوس کررہی تھی کہ میں نے ناحق انھیں چھیڑا۔ مگر کیلاش ایک نہ سنتا تھا۔ معشوقہ کے روبرو اپنے کمال کے اظہار کا ایسا موقع پا کر کون چوکتا ہے۔

ایک صاحب بولے: دانت تو توڑ ہی ڈالے ہوں گے۔

کیلاش نے ہنس کر کہا، جی نہیں بندہ نواز دانت توڑنا مداریوں کا کام ہے۔ کسی کے دانت نہیں توڑے گئے۔ کہیے تو دکھادوں۔

یہ کہہ کر اس نے ایک کالے سانپ کو پکڑ لیا اور بولا۔ میرے پاس اس سے بڑا اور زہریلا دوسرا جانور نہیں ہے اگر کسی کو کاٹ لے تو آناً فاناً آدمی مرجائے، اس کا کوئی علاج نہیں، دکھادوں اس کے دانت!

مرنالنی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا، نہیں، نہیں کیلاش۔ ایشور کے لیے اسے چھوڑ دو۔ تمھارے پیروں پڑتی ہوں۔

اس پر ایک دوسرے مہربان بولے، مجھے یقین تو نہیں آتا، مگر چونکہ تم کہتے ہو اس لیے مان لیتا ہوں۔

کیلاش نے سانپ کی گردن پکڑ کر کہا۔ نہیں صاحب آپ آنکھوں سے دیکھ لیجیے تب مانیے۔ دانت توڑ کر قبضہ میں کیا تو مجھ میں اور مداریوں میں فرق ہی کیا رہا۔ سانپ بڑا سمجھدار ہوتا ہے، اگر اسے یقین ہوجائے کہ اس آدمی سے مجھے کوئی گزند نہ پہنچے گا تو وہ اسے ہرگز نہ کاٹے گا، دانت اس کا آلۂ مانعت ہے۔

مرنالنی نے دیکھا کیلاش پر اس وقت جنون سوار ہے تو اس نے یہ تماشا ختم کرنے کو کہا اور بولی اب یہاں سے چلو، دیکھو باہر گانا شروع ہوگیا۔ آج میں بھی کوئی چیز سناؤں گی۔ یہ کہہ کر اس نے کیلاش کا کندھا پکڑ کر چلنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے چلی گئی۔ مگر کیلاش معترضوں کو خاموش کر کے ہی دم لینا چاہتا تھا۔ اس نے سانپ کی گردن پکڑ کر اتنے زور سے دبائی کہ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ جسم کی ساری رگیں تن گئیں۔ سانپ نے اب تک اس کے ہاتھوں اس قسم کا بے رحمانہ برتاؤ نہ دیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ اسے شاید یہ خیال ہوا کہ یہ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ اپنی محافظت کے لیے آمادہ ہوگیا، کیلاش نے اس کی گردن دبا کر اس کا منھ کھول دیا اور اس کے دانت دکھاتے ہوئے بولا۔ جن صاحبوں کو شبہ ہو آ کر دیکھ لیں، آیا یقین؟ یا اب بھی شک ہے؟

دوستوں نے قریب آ کر اس کے دانت دیکھے اور کیلاش کے کمال کا اعتراف کرنے لگے۔ عینی شہادت کے سامنے شبہ کی گنجائش کہاں، ان کا اطمینان کر کے کیلاش نے سانپ کی گردن ڈھیلی کردی اور اسے زمین پر رکھنا چاہا مگر وہ کالا گیہوں غضبناک ہو رہا تھا، گردن نرم پڑتے ہی اس نے سر اٹھا کر کیلاش کی انگلی میں زور سے کاٹا اور وہاں سے بھاگا، انگلی سے ٹپ ٹپ خون

ٹیکنے لگا۔ کیلاش نے فوراً زور سے انگلی دبالی اور اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ اس کی میز کی دراز میں ایک جڑی رکھی ہوئی تھی جس کے استعمال سے قاتل زہر بھی رد ہو جاتا تھا۔ دوستوں میں اتھل پتھل پڑ گئی۔ ڈاکٹر صاحب بدحواس ہو کر دوڑے وہ جڑی بوٹی کے قائل نہ تھے، انگلی کو جڑ سے کاٹ دینا چاہتے تھے۔ پر کیلاش کو جڑی پر کامل اعتقاد تھا، فوراً جڑی پیسی گئی اور انگلی پر اس کا لیپ کیا گیا۔ کیلاش تو مطمئن ہو کر باقی سانپوں کو ڈربے میں بند کرنے لگا، مگر ڈاکٹر صاحب اور دوسرے احباب پریشان تھے۔ مرنالنی پیانو چھوڑ کر دوڑی آئی تھی وہ بار بار ڈاکٹر صاحب سے کہتی آپ نشتر لگا دیجیے۔ مگر ڈاکٹر صاحب تذبذب کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ مشکل سے پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ کیلاش کے سر میں چکر سا محسوس ہوا اور دیکھتے دیکھتے اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑنے لگا، مگر ابھی تک وہ ضبط کیے کھڑا تھا اور سب سے کہتا تھا آپ لوگ اندیشہ نہ کریں میں بالکل اچھا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب خاموش کھڑے تھے پر کیلاش کے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ دیکھ کر ان کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ آخر نہ رہا گیا، وہ جلدی سے مطب میں آگئے اور کئی چیزیں ایک گلاس میں ملا کر لائے۔ کیلاش نے ایک بے غرضانہ انداز سے گلاس لے لیا اور منہ میں لگانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ وہیں زمین پر لیٹ گیا اور ہاتھ سے پنکھا جھلنے کا اشارہ کیا۔ میز کا پنکھا لگا دیا گیا اور تیز ہوا چلنے لگی۔ مرنالنی نے دوڑ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی، کیلاش کیسی طبیعت ہے؟ کیلاش نے ہاتھ اوپر اٹھا دیا، پھر منہ سے کچھ نہ بول سکا۔

مسز چڈھا نے بگڑ کر شوہر سے کہا۔ کھڑے منہ کیا تاک رہے ہو، کوئی چیز دیتے کیوں نہیں؟

مرنالنی نے کہا۔ ماں دیکھیے، ان کا چہرہ کیسا ہوا جاتا ہے۔

چڈھا نے پچھتا کر کہا۔ کیا بتلاؤں، میں اس کی باتوں میں آگیا، اب نشتر سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

یہ کہتے ہوئے انھیں کچھ خیال آگیا، پھر دوڑے ہوئے مطب میں گئے۔ اور کوئی مرکب بنا کر لائے۔ بڑی مشکل سے کیلاش کا منہ کھولا گیا اور دوا ڈالی گئی۔ مگر زہر اتنا قاتل تھا کہ دوبارہ لہر نہ آئی، دوا کا کچھ اثر نہ ہوا۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ کیلاش کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے، چہرہ سفید ہو گیا، نبض کا کہیں پتہ نہیں، موت کی ساری علامتیں نمودار ہو گئیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ مرنالنی ایک طرف سر پیٹنے لگی۔ ماں الگ پچھاڑیں کھانے لگی اور ڈاکٹر چڈھا تو ایسے بدحواس ہو گئے کہ اگر دوستوں نے نہ پکڑ لیا ہوتا تو شاید اپنے گلے پر نشتر چلا لیتے۔

ایک صاحب بولے، کوئی منتر جھاڑنے والا مل جائے تو ممکن ہے اب بھی جان بچ جائے۔

دوسرے صاحب نے فرمایا۔ ارے صاحب قبر سے نکلی ہوئی لاشیں زندہ ہو گئی ہیں، ایسے ایسے باکمال پڑے ہوئے ہیں۔

چڈھا نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا، میری عقل پر پتھر پڑ گیا تھا، کہ اس کی باتوں میں آگیا۔ نشتر لگا دیتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ بار بار سمجھاتا رہا کہ بیٹا سانپ نہ پالو، جان کا خطرہ ہے۔ مگر میری کون سنتا تھا۔ بلائیے کسی جھاڑنے والے کو بلائیے، میرا سب کچھ لے لے۔ میں اپنی ساری جائداد اس کے پیروں پر رکھ دوں گا۔ لنگوٹی باندھ کر گھر سے نکل جاؤں گا۔ مگر میرا کیلاش میرا لخت جگر اٹھ بیٹھے۔ ایشور کے لیے بلائیے، مجھ پر رحم کیجیے۔

بنگلے سے کچھ دور پر کئی گوالے رہتے تھے ان میں سے ایک سانپ کا منتر جانتا تھا۔ اس نے آ کر کئی بار منتر پڑھا کئی بار کیلاش کے کان میں چلایا، پھر پچاسوں گھڑے پانی اس کے اوپر ڈلوائے۔ پر بازیافت کی کوئی علامت نہ دیکھ کر مایوس چلا گیا۔ ایک دو منتر والے اور بھی آئے ان سبھوں نے بھی منتر پڑھے، دوائیں پلائیں، سنگھائیں، نہلایا، شور مچایا مگر کوئی نتیجہ نہ دیکھ کر رخصت ہو گئے۔ چوتھے نے آ کر کیلاش کی صورت دیکھتے ہی کہا۔ اب میں کیا منتر پڑھوں سرکار، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

ظالم! یہ کیوں نہیں کہتا کہ جو کچھ نہ ہونا تھا ہو چکا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ کہاں ہوا۔ ماں باپ نے بیٹے کا سہرا کہاں دیکھا۔ مرنالنی کی آغوش محبت میں بیٹھنا کہاں نصیب ہوا۔ زندگی کے وہ سنہرے خواب جن سے زندگی نو بہار ہو جاتی تھی کیا پریشان نہیں ہو گئے۔ تمناؤں کی زرنگار جھیلوں میں لطف سیر اٹھاتے ہوئے کیا ان کا بجرا غرقاب نہیں ہو گیا۔ جو ہونا تھا وہ کہاں ہوا۔ جو کچھ نہ ہونا تھا وہ البتہ ہو گیا۔

وہی نورانی سبزہ زار تھا۔ وہی سنہری چاندنی ایک نغمۂ خاموش کی طرح منظر پر چھائی ہوئی تھی۔ وہی مجمع احباب تھا، وہی تفریح کے سامان تھے۔ مگر اب ان پر تارے ماتم کرتے تھے اور شبنم آنسو بہاتی تھی۔ بارات وہی تھی، پر دولہا رخصت ہو گیا تھا۔

(3)

ایک چھوٹے سے کچے مکان میں ایک بوڑھا اور ایک بڑھیا انگیٹھی کے سامنے بیٹھے جاڑے کی رات کاٹ رہے تھے۔ انگیٹھی میں آگ نہ تھی۔ صرف من کو بہلانے کا ایک سامان تھا۔ زمین پر پڑی ہوئی پوال اور دو تار تار کمبل خوش آئند نیند کے ضامن نہ ہو سکتے تھے۔ انگیٹھی میں کم سے کم گرم راکھ تو تھی۔ دونوں خاموش تھے، دونوں صبر کے پتلے اور صبر بھی کیسا؟ بے عذر، ان کی

زبان پر نہ زمانے کا شکوہ تھا۔ نہ مرنے والوں کا ذکر غم! ان کا سارا وقت مضاف حیات میں صرف ہوتا تھا۔ موت دروازے پر کھڑی دستک دے رہی تھی۔ باتوں کی کہاں فرصت، فردا ہی نہ ہو تو غم کس کا۔

بڑھیا نے بڑی دیر کے بعد پوچھا کل کے لیے سن تو ہے ہی نہیں، کیا ہوگا؟

جا کر جھگڑو ساہ سے ادھار لاؤں گا۔

اس کے پہلے کے پیسے تو ابھی دیے ہی نہیں ادھار نہ دے گا۔

نہ دے گا نہ سہی، گھاس تو نہیں گئی ہے۔ دوپہر تک کیا دو آنہ کی بھی نہ چھیل سکوں گا۔ اور کیا کرنا ہے۔

اتنے میں ایک آدمی نے دروازے پر آواز دی۔ بھگت سو گئے کیا؟ ذرا کواڑ کھولو۔ میں ہوں منگلی۔

بھگت نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ منگلی نے کوٹھری میں آ کر کہا۔ کچھ سنا چڑھا بابو کے لڑکے کو سانپ نے کاٹ لیا؟

بھگت نے چونک کر سر اٹھایا "چڑھا بابو کے لڑکے کو؟ وہی چڑھا بابو ہیں نہ جو بنگلے میں رہتے ہیں، پورب طرف۔"

منگلی نے کہا "ہاں ہاں وہی۔ نامی آدمی ہیں چاروں اور ہلا مچا ہوا ہے۔ جاتے ہو وہاں؟ آدمی بن جاؤ گے!"

بوڑھے نے بے رحمانہ انداز سے سر ہلا کر کہا۔ "میں نہیں جاتا میری بلا جائے۔ وہی چڑھا ہیں کھوب (خوب) جانتا ہوں، آدمی نہیں کسائی (قصائی) ہے آج آٹھ سال ہوئے......"

بڑھیا نے تصحیح کی، "نواں لگا ہے۔"

بوڑھا۔ "ہاں نواں سال ہے، میں پنّا کو لے کر دکھانے گیا تھا۔ کھیلنے جا رہے تھے۔ پیروں پر گر پڑا کہ ایک نجر (نظر) دیکھ لیجیے مگر اس نے بات تک نہ سنی۔ بھگوان بیٹھے سن رہے تھے۔ اب معلوم ہوگا کہ بیٹے کا غم کیسا ہوتا ہے۔ کئی لڑکے ہیں؟"

منگلی: "نہیں جی یہ تو ایک لڑکا ہے۔ سنا ہے سب لوگوں نے جواب دے دیا۔ گنگو کوالا، مدو بہنا، منے مصر سب ہار کر چلے آئے۔"

بوڑھا: "بھگوان بڑا کارساج ہے۔ ارے تم سے کیا کہوں، اس کے پیروں پر گر کر رویا۔ اس کے پیروں پر پگڑی اتار کر رکھ دی۔ مگر اسے جرا (ذرا) بھی دیا نہ آئی۔ میں تو اس کے دروجے (دروازے) پر ہوتا تب بھی بات نہ پوچھتا، ایسے لوگوں کی یہی سجا (سزا) ہے۔"

منگلی: "تو نہ جاؤ گے؟ ہم نے تو سنا تھا تم سے کہہ دیا۔"

بوڑھا: "بہت اچھا کیا۔ سن کر کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا، آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ تم جاؤ، آج چین کی نیند سوؤں گا (بڑھیا سے) جرا تماکو لے لے۔ ایک چلم اور پیوں گا۔ اب معلوم ہوگا لالہ کو، ساری صاحبی بھول جائے گی، ہمارا کیا بگڑا، کچھ لڑکے کے مر جانے سے راج تو نہیں چلا گیا۔ تمھارا تو راج سونا ہو جائے گا۔ اسی لڑکے کے واسطے سب کا گلا دبا دبا کر دھن جوڑا تھا نہ، اب کیا کرو گے؟"

منگلی چلا گیا۔ بھگت نے چلم اٹھائی اور پڑوس کے حلوائی کی بھٹی سے آگ رکھ لایا، پھر کواڑ بند کر کے اطمینان سے چلم پینے لگا۔

بڑھیا نے کہا۔ "اتنی رات گئے جاڑے پالے میں بیجنے آیا تھا، موئے کو شرم بھی نہ آئی۔"

بوڑھا: "رات نہیں دوپہر بھی ہوتی تو میں نہیں جاتا، اس کی سواری درواجے پر آتی تو بھی نہ جاتا۔ بھول نہیں گیا ہوں، پنّا کی صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اس نرموہی نے ایک نجر بھی تو نہیں دیکھا۔ کیا میں نہ جانتا تھا کہ وہ نہ بچے گا؟ کھوب جانتا تھا، وہ بھگوان نہیں تھا کہ اس کے ایک نجر دیکھ لینے سے امرت برس جاتا۔ نہیں، کھالی من کی دوڑ تھی۔ جرا تسکین ہو جاتی۔ بس اسی لیے اس کے پاس دوڑا گیا تھا۔ اب کسی دن پھر جاؤں گا اور کہوں گا۔ کیوں صاحب! کہیے کیا رنگ ہے؟ دنیا مجھے برا کہے گی۔ کہے، کوئی پرواہ نہیں۔ چھوٹے آدمیوں میں تو سب عیب ہوتے ہی ہیں۔ بڑوں میں کوئی عیب نہیں ہوتا، وہ دیوتا ہوتے ہیں......"

اسّی سال کی عمر میں بھگت کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ ایسے سانحے کی خبر سن کر بھی وہ گھر سے باہر نہیں نکلا۔ ماگھ پوس کی اندھیری رات، جیٹھ بیساکھ کی دھوپ اور لو، ساون بھادوں کی موسلا دھار مینہ، کسی کی اس نے کبھی پرواہ نہ کی۔ وہ فوراً گھر سے نکل پڑتا تھا۔ بے منت، بے غرض، معاوضے کا خیال بھی دل میں آیا ہی نہیں، نہ کبھی کسی نے کچھ دیا ہی۔ یہ معاوضے کا کام ہی نہ تھا۔ جان کا کیا معاوضہ۔ یہ ایک کار ثواب تھا۔ اسے جو دَیا آتی تھی اس کا لازمی استعمال۔ سیکڑوں مایوسوں کو اس کے منتروں نے زندگی عطا کر دی تھی، پر آج وہ گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔ اپنے کانوں سے یہ خبر سن کر بھی اطمینان سے سونے کی کوشش کر رہا ہے۔

بڑھیا نے کمبل اوڑھ کر لیٹتے ہوئے کہا۔ "تماکو کے ڈھائی پیسے ہو گئے۔ آج دیتی ہی نہ تھی۔"

بھگت نے کپی بجھائی اور کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر بیٹھ کر کچھ سوچتا رہا۔ بعد ازاں لیٹ گیا، یہ خبر اس کے جگر پر بوجھ کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تھا اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے، جیسے سارے کپڑے گیلے ہو گئے ہیں، یا

پیروں میں کیچڑ لگا ہوا ہے جیسے کوئی اس کے دل کے اندر بیٹھا ہوا اسے گھر سے نکلنے کے لیے تحریک کر رہا ہے۔ بڑھیا ذرا دیر میں خراٹے لینے لگی۔ بوڑھے بولتے بولتے سو جاتے ہیں اور چوہے کا رینگنا سن کر جاگ اٹھتے ہیں۔ بھگت کو جب اطمینان ہو گیا کہ بڑھیا سو گئی ہے تو وہ اٹھا، اپنی لکڑی ٹٹول کر اٹھائی اور دھیرے سے کواڑ کھولے۔

بڑھیا چونک پڑی، بولی۔ ''کہاں جاتے ہو؟''

''کہیں نہیں، دیکھتا تھا کتنی رات گئی ہے۔''

''ابھی بہت رات ہے، سو جاؤ۔''

''نیند نہیں آتی۔''

''نیند کا ہے کو آئے گی، من تو چڈھا بابو کے گھر پر لگا ہوا ہے۔''

''چڈھا بابو نے میرے ساتھ ایسی کون سی نیکی کر دی ہے جو وہاں جاؤں۔ وہ آ کر پیروں پڑیں تب بھی نہ جاؤں۔''

''مانو چاہے نہ مانو، پر تم اٹھے اسی ارادے سے تھے۔''

''نہیں ری، ایسا پاگل نہیں ہوں کہ جو مجھے کانٹے بوئے اس کے لیے پھول بوتا پھروں۔''

بڑھیا پھر سو گئی، بھگت نے کواڑ لگا دیے اور پھر آ کر بیٹھا، مگر اس کے دل کی حالت اس کتے کی سی ہو رہی تھی جو رات کو کسی اجنبی کی آہٹ پا کر مالک کے منع کرنے پر بھی بھونکنا نہیں چھوڑتا۔ زور سے چاہے نہ بھونکے مگر آہستہ آہستہ غراتا رہتا ہے۔ بھگت کا نفس اسے اپنی پوری طاقت سے روک رہا تھا پر اس کے وجود کا ایک ایک ذرہ ہوا کے جھونکے سے اڑے ہوئے پتے کی طرح اس بدنصیب نوجوان کی طرف اڑا جا رہا تھا جو اس وقت مر رہا تھا اور جس کے لیے ایک ایک لمحے کی دیر بازیافت کے امکان کو اور دور ٹال رہی تھی۔

اس نے پھر کواڑ کھولے۔ اتنے آہستہ سے کہ بڑھیا کو خبر نہ ہوئی۔ باہر نکل آیا، اسی وقت محلے کا چوکیدار گشت لگا رہا تھا۔ بولا، کیسے اٹھے بھگت آج تو بڑی سردی ہے کہیں جا رہے ہو کیا؟

بھگت نے کہا، ''نہیں جی جاؤں گا کہاں۔ دیکھتا تھا کہ ابھی کتنی رات ہے، بھلا کے بجے ہوں گے؟''

''ایک بجا ہوگا اور کیا، ابھی تھانے سے آ رہا تھا تو چڈھا کے بنگلے پر بڑی بھیڑ لگی تھی ان کے لڑکے کا حال تو تم نے سنا ہوگا۔ کالے نے چھو لیا ہے، چاہے مر بھی گیا ہو، تم چلے جاؤ تو سائت (شاید) بچ جائے۔ سنا دس ہجار (ہزار) تک دینے کو تیار ہیں۔ نہ دس ہجار دیں گے دس سو تو دیں گے۔''

''میں تو نہ جاؤں گا چاہے وہ دس لاکھ بھی دیں، مجھے دس ہجار لے کر کرنا ہی کیا ہے، کل کو مر جاؤں گا تو کون بھوگے گا۔ میں تو ان کے دروازے پر ہوتا تب بھی نہ جاتا، ایسے بیدردوں کی سجا یہی ہے۔''

چوکیدار چلا گیا۔ بھگت نے آگے پیر بڑھائے، جیسے کسی مخمور آدمی کا اپنے فعلوں پر قابو نہیں ہوتا۔ وہ کہتا کچھ ہے زبان سے نکلتا کچھ ہے۔ وہ اپنی دانست میں پاؤں سنبھال کر رکھتا ہے پر وہ لغزش کرتے ہیں۔ وہی حالت بھگت کی تھی۔ نفس انتقام پر تلا ہوا تھا پر عمل پر اس کا قابو نہ تھا۔ جس نے کبھی تلوار نہیں چلائی وہ ارادہ کرنے پر بھی تلوار نہیں چلا سکتا اس کے ہاتھ کانپتے ہیں۔

دو میل کا راستہ تھا۔ بھگت لاٹھی کھٹ کھٹ کرتا چلا جاتا۔ ادراک ثانی اولی پر حاوی تھا۔ اولی روکتا تھا، ثانی ٹھیلتا تھا۔ آدھا راستہ طے ہو جانے پر یکایک بھگت رک گیا۔ نفس نے قوت عمل پر فتح پائی۔ ارے! میں اتنی دور چلا آیا! اس جاڑے پالے میں مجھے مرنے کی ضرورت کیا تھی۔ آرام سے پڑا کیوں نہ رہا نہ نیند آتی دو چار بھجن ہی گاتا۔ ناحق اتنی دور دوڑا، چڈھا کا لڑکا رہے یا جائے، میری بلا سے مجھے کیا کرنا ہے۔ دنیا میں ہزاروں مرتے ہیں، ہزاروں جیتے ہیں۔ مجھے کسی کے مرنے جینے سے مطلب۔ جس نے میرے ساتھ ذرا بھی سلوک نہیں کیا۔ اس کے ساتھ میں کیوں سلوک کروں؟

مگر نفس کی یہ فتح عارضی تھی۔ وہ ادراک ثانی جو اسے اتنی دور لایا تھا، ایک دوسری ہی صورت میں نمودار ہوا جو نفس سے بہت متشابہ تھا۔

میں وہاں کچھ سانپ کا منتر پڑھنے تھوڑا ہی جا رہا ہوں۔ ذرا دیکھوں گا، لوگ کیا کرتے ہیں۔ ذرا ڈاکٹر صاحب کا رونا پیٹنا دیکھوں گا۔ کس طرح سر پیٹتے ہیں، کس طرح پچھاڑیں کھاتے ہیں۔ ذرا دیکھوں گا بڑے لوگ بھی ہمیں لوگوں کی طرح روتے ہیں یا صبر کر جاتے ہیں۔ وہ لوگ تو ودوان ہوتے ہیں۔ من میں سمجھ کر رہ جاتے ہوں گے۔ اس طرح نفس کو دھوکا دیتا ہوا، شیطان کو بہکاتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا کہ دو آدمی راستے سے گزرے۔ ڈاکٹر چڈھا ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک نے کہا چڈھا بابو کا گھر اجڑ گیا۔ دوسرا بولا کسل بھی ہے کہ ابھی بیاہ نہیں ہوا تھا۔ بھگت کی چال اور بھی تیز ہو گئی۔ ضعف کے مارے قدم نہ اٹھتے تھے۔ مگر ہمت ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ سر کا حصہ اتنا آگے بڑھا جاتا تھا گویا اب منہ کے بل گر پڑے گا۔ اس طرح کوئی بیس منٹ چلا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ نظر آیا۔ بجلی کی بتیاں روشن تھیں۔ مگر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نالہ و شیون کی صدائیں بھی نہ سنائی دیتی تھیں۔ اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ کہیں دیر تو نہیں ہو گئی۔ وہ دوڑنے لگا۔ اپنی عمر میں وہ اتنا تیز کبھی نہ دوڑا تھا۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا گویا اس کے پیچھے موت دوڑی آ رہی ہے۔

(4)

کیلاش بے جان پڑا ہوا تھا۔ جسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ہونٹ سیاہ پڑ گئے تھے۔ زندگی کی کوئی علامت باقی نہ تھی۔ مگر کوئی بلند آواز سے نہ روتا تھا۔ گریہ

خاموش ڈوبنے والی امید کی آخری شعاع تھی۔

یکایک بھگت نے برآمدے میں پہنچ کر پکارا۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھا کوئی مریض آیا ہوگا۔ کسی اور وقت انھوں نے اس آدمی کو دھتکار دیا ہوتا۔ رات کے وقت وہ کسی مریض کو نہ دیکھتے تھے۔ مگر آج وہ فوراً گھر میں سے نکل آئے اور رقت آمیز انداز سے بولے۔ ''کیا ہے بھئی، آج تو ہمارے اوپر ایسی مصیبت آپڑی ہے کہ کچھ کہتے نہیں بنتا۔ پھر کبھی آنا۔''

بھگت نے کہا۔ ''سب حال سن چکا ہوں بابو صاحب۔ اسی لیے تو آیا ہوں۔ جرا میں بھی دیکھ لوں چھوٹے بھیا کہاں ہیں۔ بھگوان بڑا کارساج ہے۔ کون جانے اب بھی اسے دیا آجائے۔''

ڈاکٹر چڈھا نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ ''اچھی بات ہے چلو دیکھ لو۔ تین چار گھنٹے ہوگئے ہیں۔ ہم تو نراش ہو گئے۔''

بھگت نے اندر جا کر ایک منٹ تک لاش کو دیکھا تب مسکرا کر بولا ''ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے بابو جی! نارائن چاہیں گے تو آدھ گھنٹہ میں بابو جی اٹھ بیٹھیں گے۔ جرا کہاروں سے کہیے پانی تو بھریں۔''

بوڑھے کا لہجہ اتنا یقین انگیز تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو کچھ امید پیدا ہوگئی۔ بولے، ''بوڑھے بابا بس یہی سمجھ لیجیے کہ ہم سب عمر بھر آپ کے غلام بنے رہیں گے۔ اس لڑکے پر ہم اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔

مسز چڈھا نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ''دادا یہی ہماری جنم بھر کی کمائی ہے بس اور کیا کہوں۔''

بوڑھے بھگت کے پاس ایک ایسی جڑی تھی کہ سانپ کیسا ہی زہریلا ہو اس کا زہر زائل ہو جاتا تھا۔ اس جڑی کے ساتھ ہی وہ ایک منتر بھی پڑھتا تھا۔ اس منتر میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ پہلے ہی دم میں مارگزیدہ کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ بھگت کو اپنے روزہر کی طاقت پر پورا اعتماد تھا۔ آج تک اسے کبھی ناکامی نہ ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اس قسم کی خبر پاتے ہی اضطراری طور پر گھر سے نکل پڑتا تھا۔ وہ آدھ گھنٹہ تک کھڑا منتر پڑھتا رہا۔ ایک بار منتر ختم ہو جانے پر وہ کیلاش کو جڑی سنگھا دیتا تھا۔ ادھر کہار لوگ کیلاش کے سر پر پانی انڈیلتے چلے جاتے تھے۔ دو بجتے بجتے کیلاش نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ بیٹھا۔

بھگت نے پوچھا۔ ''بابو یہاں کسی کو پہچانتے ہو؟''

کیلاش نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر کہا۔ ''ہاں صاحب۔ سب کو پہچانتا ہوں۔ وہ پاپا ہیں، یہ ماما ہیں۔ وہ مرنالنی ہیں۔''

مسز چڈھا بھگت کے پیروں پر گر پڑیں۔ ڈاکٹر چڈھا دوڑ کر کیلاش کے گلے سے لپٹ گئے۔ چاروں طرف سے احباب نے مبارک باد دینا شروع کیا۔ بھیتر باہر ہلچل مچ گئی۔ کمرے میں دوستوں کا ایسا ہجوم ہوا کہ تل رکھنے کی بھی جگہ نہ رہی۔ ہر شخص بھگت کے درشنوں کا مشتاق تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لپک کر اپنا سیف کھولا اور گنیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی نکال لائے۔ وہ اسے بھگت کے پیروں پر رکھ دینا چاہتے تھے۔ مگر جب تھیلی لے کر کمرے میں پہنچے تو بھگت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف بھگت کی تلاش ہونے لگی۔ کہاں گئے۔ کہاں گئے، ابھی تو یہیں کھڑے تھے۔ بھیتر باہر سب جگہ چھان ڈالی گئی مگر بھگت کا کہیں پتہ نہ تھا۔

مسز چڈھا نے کہا ''کوئی دیوتا تھا۔''

احباب نے کہا ''ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔''

پھر جشن شروع ہوا۔ نغمہ کی صدائیں بلند ہوئیں اور باجے بجنے لگے۔

بھارت 2004

یہ کتاب اردو زبان میں بھارت کے بارے میں معتبر اور مفید معلومات کا خزانہ ہے۔ بھارت کی تمام ریاستوں اور مرکزی علاقوں کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، اقتصادی، تجارتی، صنعتی اور لسانی منظرنامے سے مستند واقفیت حاصل کرنے کے لیے آپ کے پاس اس کتاب کی موجودگی ضروری ہے۔ مرکزی اور صوبائی ملازمتوں کے مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے والے طلبہ کے لیے یہ کتاب خصوصی اہمیت اور افادیت کی حامل ہے۔

صفحات: 949، قیمت: -/250 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

نیر مسعود　　　ہماری مطبوعات　　　''انیس'' (سوانح) سے اقتباس

انیس باشندۂ لکھنؤ

امجد علی شاہ کے زمانے سے انیس کی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں وہ لکھنؤ کے ایک مہمان شاعر کے بجائے میر انیس لکھنوی ہوگئے اور ان کا شمار اس شہر کے اکابر اور جانی پہچانی شخصیتوں میں ہونے لگا۔

''انیس کی مستند ترین تصویر وہ ہے جو ان کے ایک قدردان نے کسی باکمال مصور سے ہاتھی دانت کی تختی پر بنوا کر ان کو پیش کی تھی۔ انیس کی جو تصویریں عام طور پر چھپتی رہتی ہیں وہ اسی ہاتھی دانت والی تصویر کا نقشِ مستعار ہیں۔ لیکن ان نقلوں میں اصل کے موقلم کی باریکیاں نہیں آسکیں۔ اصل تصویر میں انیس کی غلافی آنکھیں، آنکھوں کے نیچے باریک جھریاں، رخساروں کی ہڈیوں کا ہلکا سا ابھار، ذرا پھیلے ہوئے نتھنے اور بھینچے ہوئے پتلے پتلے ہونٹ مل کر ایک ایسے شخص کا تاثر پیدا کرتے ہیں جو بہت ذکی الحس اور ارادے کا مضبوط ہے۔ دنیا کو ٹھکرا دینے کا نہ صرف حوصلہ رکھتا ہے بلکہ شاید ٹھکرا بھی چکا ہے۔ وہ کسی کو اپنے ساتھ زیادہ بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا اور کسی سے مرعوب نہیں ہوسکتا۔ اور اس کی خاموش اور بہ ظاہر پرسکون شخصیت کی تہ میں تجربات اور تاثرات کا ایک طوفان برپا ہے۔''

(مضمون ''میر انیس کی شخصیت اور مزاجی کیفیت'')

یہ تصویر (جو میر علی محمد عارف کے خاندان میں موجود ہے) انیس کا صرف ناک نقشہ (اور جزئی طور پر لباس) دکھاتی ہے۔ کچھ اور بیان انیس کا پورا حلیہ دکھاتے ہیں۔ میر سید علی مانوس نے ادیب کو انیس کا یہ حلیہ لکھوایا تھا:

''قد میانہ مائل بہ درازی، ورزش کی وجہ سے جسم ٹھوس، اعضا متناسب و چست، چھریرا بدن، چوڑا سینہ، صراحی دار گردن، خوبصورت کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، گیہواں رنگ، مونچھیں ذرا بڑی، داڑھی اتنی باریک کترواتے تھے کہ دور سے منڈی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔''　(کاغذاتِ ادیب)

میر عبدالعلی کا بیان ہے کہ انیس کا ''قد لمبا، میانہ سے کچھ زیادہ تھا۔ ان کا بدن چست، ٹھوس اور چھریرا تھا۔''　(''انیسیات'')

شاد مونس کو کشیدہ قامت بتانے کے بعد انیس کا حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں: ''میر انیس کا قد میر مونس سے کم ...... تھا۔ رنگ کھلا ہوا گندمی، چہرہ پتلا مگر حسین ...... ناک، آنکھیں، پیشانی، سب مناسب ...... سراپا میں کھنچاؤ۔''　(''فکرِ بلیغ'' 250-51)

اشہری بتاتے ہیں: ''میر انیس کا قد لانبا، چھریرا، متناسب الاعضا تھا۔ سر کے بال باریک و ملائم، چہرہ خوبصورت و کتابی، آنکھیں بڑی بڑی خوبصورت جن کی خوش آب سفیدی نرگس کا لطف دیتی تھی۔ آنکھوں کے تیور سے غیورانہ حالت ظاہر ہوتی تھی۔ پتلی کی روشنی بہت تیز تھی۔ مونچھیں بڑی بڑی افگندہ مو، داڑھی صاف، گردن صراحی دار، ...... سینہ کشادہ، ...... مگر زیادہ ابھرا ہوا نہیں۔ چال نہایت نستعلیق، دھل کیا جو نپے تلے قدم سے آگے بڑھ جائے۔''

(''حیاتِ انیس'' 26-25)

احسن انیس کا یہ حلیہ بتاتے ہیں:

''سانولا رنگ، قد مائل بہ درازی، چہرے کے نقش و نگار مجموعی طور پر خوش نما تھے۔ ورزشی جسم، ظاہر میں ایسے قوی اور فربہ نہیں معلوم ہوتے تھے مگر دراصل چوڑا سینہ اور رسڈول بازو جسم کی کساوٹ پر دلیل کرتے تھے۔ داڑھی باریک کترواتے تھے۔ اکثر لوگوں کو حلق (داڑھی منڈوانے) کا شبہ ہوتا تھا۔

(واقعاتِ انیس 30)

سردار میرزا احسن کی (اور اس طرح مانوس کی بھی) تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ دونوں صاحبوں (انیس اور نفیس) کی داڑھی نہ تھی۔''

(ردِ واقعاتِ انیس، 25)

سردار میرزا نے (اور اشہری نے بھی) انیس کو غالباً نزدیک سے نہیں دیکھا تھا۔ انیس کے لباس کے متعلق نسبتاً زیادہ معلومات ملتی ہے جو اس طرح ہے:

(میر عبدالعلی) ''میر انیس ہمیشہ کرتا پہنتے تھے۔ پاجامہ عرض کا سفید ہوتا تھا۔ انس اور مونس ریشمی پانجامے پہنتے تھے۔ ممکن ہے کہ انیس بھی ریشمی پاجامہ پہنتے ہوں، مگر مجھے سفید ہی یاد ہے۔ کچھ کچھ خیال ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ

● میر ببر علی انیس کا بحیثیت مرثیہ گو کوئی ثانی نہیں ہے۔ ممتاز محقق جناب نیر مسعود کی یہ کتاب انیس کے احوال و کوائف کے علاوہ ان کی زندگی کے اہم واقعات کا احاطہ کرتی ہے اور ان واقعات نے ان کی شاعرانہ شخصیت کی تعمیر و تشکیل پر جو اثرات مرتب کیے ان کی طرف بھی بلیغ اشارہ کرتی ہے۔ 472 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 174 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد رعایت دیتی ہے۔

دیانت الدولہ کی کربلا میں میں نے میر صاحب کو انگرکھا پہنے دیکھا تھا۔"

("انیسیات" 53)

(مانوس) "میر انیس بالعموم گھٹنوں سے کچھ نیچا کرتا پہنتے تھے۔ زیادہ سردی میں انگرکھے کی قطع کا دگلا یا خوب گھیردار لبادہ بھی پہن لیتے تھے جو گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔ پائجامہ گرمیوں میں سفید اور جاڑوں میں مشروع یا گل بدن کا پہنتے تھے جس کا رنگ زیادہ تر سبز یا اودا ہوتا تھا۔ ہاتھ میں رومال اکثر رکھتے تھے۔ کبھی کبھی دوپٹا آڑا کر کے کندھے پر ڈال لیتے تھے۔ جوتا گھیتلا پہنتے تھے، گھر میں زرد مخمل کا سادہ اور باہر کا چوبی جس کی قیمت پچیس تیس روپے ہوتی تھی۔ گرمیوں میں انگرکھا کبھی نہیں پہنتے تھے۔" ("انیسیات" 55)

انیس کی پوشاک کے بارے میں مانوس کا لکھوایا ہوا ایک اور بیان ادیب کے کاغذات میں موجود ہے۔ اس میں وہ باتیں جو مندرجہ بالا بیان میں نہیں آئیں، حسب ذیل ہیں:

"سر پر حباب کی شکل کی قالب پر چڑھی ہوئی ٹوپی جو گرمیوں میں سفید اور جاڑوں میں ریشمی کام کی رنگین ہوتی تھی۔" گرمیوں میں پہننے والا کرتا "خوب گھیردار...... جامدانی یا ململ کا ہوتا تھا۔" جاڑوں کا دگلا روئی دار ہوتا تھا۔ جاڑوں کے پائجامے کا رنگ (اودے اور سبز کے علاوہ) گلابی بھی ہوتا تھا۔ باہر پہننے والا جوتا اکثر کاریگر کو گھر پر بلوا کر بنوایا جاتا تھا۔ ہاتھ میں (رومال کے علاوہ) چھڑی بھی ہوتی تھی۔

(احسن) "ڈھیلی مہری کا پائجامہ اور بارہ کلی کا کرتا پہنتے تھے۔ ان کا کرتا اتنا لمبا چوڑا ہوتا تھا کہ اس پر انگرکھا پہننے کی ضرورت نہ تھی...... کرتے کی دونوں آستینیں بہت باریک چنی جاتی تھیں جو لچھے دار ہو کر کہنیوں تک خود بہ خود چڑھ جاتی تھیں۔ پنج گوشیہ ٹوپی پہنتے تھے جس کے ہر گوشے میں صراحی اور کنٹھا یا چاند بنے ہوتے تھے۔ سادہ اور سفید لباس کا زیادہ شوق تھا۔ سفید لباس میں اس وقت کے رواج کے موافق جامدانی کے بیش قیمت کپڑے کا استعمال کرتے تھے، یا ڈھاکے کی ململ کا کرتا پہنتے تھے۔ بچے ریشمی مشروع کا پاجامہ بھی اکثر پہنتے تھے۔ کاندھے پر ایک رومال لنکلاٹ کا پڑا رہتا تھا۔ ہاتھ میں ہروقتی کی جریب۔" (واقعات 33-32)

(اشہری) "میر صاحب نے اپنے لیے وہ لباس اختیار کیا جو آخر وقت تک ان کے جسم پر موزوں رہا...... اپنے سر پر لکھنؤ کی بیضاوی پنج گوشیہ ٹوپی اس صورت کی (ٹوپی کی تصویر) لگاتے تھے...... جسم میں ایک خاص وضع کا گھیردار کرتا پہنتے تھے، اور صرف یہی کرتا ان کی وضع داری کو خاص امتیاز سے ظاہر کرتا تھا۔ کبھی گول پردے کا انگرکھا زیب جسم فرماتے تھے اور لکھنؤ کے عام رواج کے موافق غرارے کا ڈھیلا پائجامہ پہنتے تھے۔ پاؤں میں لکھنؤ کی زرد مخملی جوتی......، ہاتھ میں پتلی چھڑی اور سفید رومال ہوتا تھا۔"

("حیات انیس" 27-26)

(شاد: "سر پر پنج گوشیہ جامدانی کی ایک طرف کج ٹوپی، قالب پر شاید چڑھا کر پھر کل دیا کرتے تھے، کیونکہ اونچان تو باقی رہتی تھی مگر جھول رہتا تھا۔ گلے میں بڑے گھیر کا کرتا تنزیب کا۔ نیچے شلوکا ندارد۔ بردار سفید پائجامہ نین سکھ کا۔ ایک بڑا رومال اور مرشد آبادی جریب ہاتھ میں۔ زردوزی گھیتلا پاؤں میں۔ چھنگلیا میں دو تین انگوٹھیاں۔" (فکر بلیغ، 251)

ان بیانوں میں مانوس نے انگرکھے کی قطع کے جس دگلے کا ذکر کیا ہے غالباً اسی کو میر عبدالعلی اور اشہری نے انگرکھا بتایا ہے۔ مانوس کا کہنا ہے کہ انیس انگرکھا نہیں پہنتے تھے اور انھی سے ماخوذ یہ بیان بھی ہے:

"وہ ڈھاکے کی ململ یا ناڈے کی جامدانی کا ڈھیلا کرتا پہنتے تھے جس کی آستینیں چنی ہوئی ہوتی تھیں۔" (میر انیس اور ان کے اسلاف و اخلاف)

انیس کے لباس کے بارے میں کچھ اور معلومات حسب ذیل ہیں:

ولبی پور (بنارس) کے حکیم سید علی کی معرفت انیس اپنے لباس کے لیے بنارسی کپڑے خریدتے تھے۔ ان کے نام نفیس کے ایک خط سے انیس کے پائجاموں کی ناپ معلوم ہوتی ہے:

(ترجمہ) "جناب والا، اگر پارچے ہوں تو ہر پارچہ سوا دو گز کا ہو۔ اگر تھان ہوں تو ساڑھے چار گز سے کم کے نہ ہوں، کیونکہ ایک تھان میں دو پائجامے مع نیفے اور مغزی کے بنتے ہیں او رجناب میر صاحب کے موافق مزاج ہوتے ہیں۔" (سوا دو گز = تقریباً دو میٹر)

اسی خط کے ان فقروں سے معلوم ہوتا ہے کہ گل بدن کے پائجامے انیس صرف جاڑوں میں نہیں، گرمیوں میں بھی پہنتے تھے۔

(ترجمہ) "گل بدن کے تھانوں کا حال معلوم ہوا۔ ان کے آنے میں بڑی دیر ہوگئی۔ اکثر جناب والا ماجد مدظلہ نے مجھ سے اس تاخیر کی شکایت کی کہ میں نے گرمیوں کے لیے منگائے تھے اور اب جاڑے آپہنچے۔"

(خطوط ذخیرۂ ادیب)

حکیم سید علی کے نام انیس کے ایک خط کے اس جملے سے گل بدن کے رنگ بھی معلوم ہوتے ہیں:

(ترجمہ) "آپ کا عنایت نامہ گل بدن کے سبز اور اودے دو تھانوں کے ساتھ پہنچا" ("میر انیس کے نادر خطوط، مشمولہ "انیسیات") (احسن بتاتے ہیں کہ انیس کی "مرضی کے موافق کپڑے کی تلاش میرے والد (میر حسن علی)

کے سپرد ہوتی تھی، اور یہ خدمت اکثر انھی سے متعلق تھی۔"

("واقعاتِ انیس" 33)

حکیم سید جواد کا بیان ہے:

"میر انیس جاڑوں میں عمدہ فرد کی رضائی اوڑھا کرتے تھے اور ایک خاص ترکیب سے آنچل کاندھے پر ڈال لیا کرتے تھے۔ اس کی تقلید اور سیکھنے کو سرِشام تحسین کی مسجد کے پاس اکثر لوگ کھڑے رہتے تھے۔ بعد ان کے گزر جانے کے آپس میں مشورے کر کے اسی طور سے آنچل رضائیوں کا کاندھے پر ڈالتے، مگر پھر شک ہوتا تو دوسرے دن آ کر اپنا شک مٹاتے ...... (میں) گھڑیوں تک یہ تماشا دیکھا کرتا تھا۔" ("فکرِ بلیغ" 239)

اپنی پوشاک اور اس کے متعلقات میں انیس خاصا اہتمام کرتے تھے۔ شاد بتاتے ہیں کہ وہ "جب کپڑے سلواتے تھے تو درزی کی جان پر بنتی تھی۔ اپنے سامنے قطع کرواتے اور سمجھا بجھا کر حوالے کرتے تھے۔" ("فکرِ بلیغ" 226)

ٹوپی پہننے کی تفصیل اشہری اس طرح بتاتے ہیں:

"ٹوپی کی درستی اور خوبصورتی سے لگانے میں ان کو بڑی دلچسپی رہتی تھی۔ جب وہ کہیں تشریف لے جاتے تو لوگوں پر چڑھی ہوئی آٹھ دس ٹوپیاں حاضر کی جاتیں۔ وہ جس کو پسند فرماتے اس کو سر پر رکھتے اور آئینہ سامنے رکھ کر اس کو بار بار درست کرتے۔ جب تک وہ صحیح موزونیت حاصل نہ کرتی وہ اس شغل سے باز نہ آتے..... آخر میں جب کوئی ٹوپی صحیح مقام حاصل کر لیتی تو پھر اس مقام سے نہ ہٹاتے اور جب تک واپس آتے وہ ٹوپی اسی مقام پر اسی شان سے قائم رہتی۔" (حیاتِ انیس، 26)

انیس کا کام دار گھیتلا جوتا مانوس کے بہ قول اکثر کاریگر کو گھر پر بلوا کر بنوایا جاتا تھا۔ کاریگر کا نام سید آغا اشہر لکھنوی نے ببر علی بتایا ہے، لکھتے ہیں:

"ببر علی اس وقت لکھنؤ میں گھیتلے جوتے کی ساخت میں بہت مشہور تھا۔ اکثر رؤسا و شرفائے شہر اس کے ہاتھ کا جوتا پہنتے تھے، چنانچہ میر انیس..... (وغیرہ) نے ہمیشہ اسی کا بنایا ہوا جوتا پہنا۔" (حضرت رشید، 39-40)

انیس کے ہم نام اس کاریگر کا ذکر سرور نے "فسانۂ عجائب" کے بیانِ لکھنؤ میں اس طرح کیا ہے:

"جوتا گھیتلا خرد نوک کا میاں ببر علی نے اس نوک جھونک کا بنایا کہ جہان کو پسند آیا۔" (اکادمی ایڈیشن 54) اپنی ایک اور کتاب "فسانۂ عبرت" کے دیباچے میں بھی سرور نے ببر علی کا حوالہ یوں دیا ہے:

"کسی کے زیبِ پا کفش مطلا، یا میاں ببر علی کے ہاتھ کا مغرق گھیتلا، ستاروں سے زمین کو آسمان کا رتبہ" (ص 5)۔ اپنے گھیتلے کے ستاروں کا ذکر انیس نے وثیقۂ نجف کے قضیے میں کیا تھا جس کی تفصیل آئندہ بیان ہوگی۔

انیس کے استعمال میں آنے والی جریبوں (چھڑیوں) کے ذکر میں مانوس بتاتے ہیں کہ ان کے پاس مرشد آبادی ہروتی کی جریبیں تھیں اور "ٹین کے چونگلوں میں تیل بھر کر ان میں یہ جریبیں ڈبوئی جاتی تھیں اور رات کو نکال کر اوس میں رکھی جاتی تھیں تا کہ ان میں عنابی رنگ پیدا ہو۔ جریبوں پر چاندی کی شام ہوتی تھی اور بعض پر سونے چاندی کے تار بندھے ہوتے تھے۔"

("انیسیات" 56)

"وہ شخص منبر پر پڑھ رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جادو کر رہا ہے۔"

انیس کی مرثیہ خوانی کا یہ حال شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ کی زبانی ہے جو انھوں نے محمد حسین آزاد سے بیان کیا تھا ("آبِ حیات")۔ ذکاء اللہ نے اشہری سے بھی اس مجلس کا ذکر کیا تھا جسے اشہری نے اس طرح نقل کیا ہے:

"جب میں اس مجلس میں پہنچا تو تمام عالی شان مکان آدمیوں سے بھر چکا تھا بلکہ سیکڑوں مشتاق فرش کے کنارے زمین پر دھوپ میں کھڑے ہوئے محوِ سماعت تھے۔ میرا مجلس کے اندر جگہ پانا ناممکن تھا اس لیے میں بھی وہیں دھوپ میں کھڑا ہو کر سننے اور دور سے ٹکٹکی باندھ کر میر انیس کی صورت اور ان کے ادائے بیان کو دیکھنے لگا۔ میں میر انیس کی فصاحتِ بیان اور ان کے طرزِ بیان کی دل فریب اداؤں کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس سے پہلے کبھی ایسا خوش بیان نہیں سنا اور نہ کسی کے ادائے بیان سے یہ مافوق الفطرت اثر پیدا ہوتے مشاہدہ کیا.....معلوم ہوتا تھا کہ منبر پر ایک کل کی بڑھیا بیٹھی ہوئی لڑکوں پر جادو کر رہی ہے۔ جس کا دل جس طرف چاہتی ہے پھیر دیتی ہے، اور جب چاہتی ہے ہنساتی ہے اور جب چاہتی ہے رلاتی ہے۔ میں اسی حالت میں دو گھنٹے کے قریب کھڑا رہا۔ میرے کپڑے پسینے سے تر اور پاؤں خون اترنے سے شل ہو گئے، لیکن میں جب تک میر انیس کی صورت دیکھتا اور ان کا مرثیہ سنتا رہا، مجھ کو یہ کوئی بات محسوس نہیں ہوئی۔"

(حیاتِ انیس، 34)

میر حامد علی سے (غالباً) صفیر بلگرامی نے بیان کیا:

"میں کلامِ دبیر کا شیدائی تھا، انیس کے کمال کا قائل نہ تھا۔ ایک مرتبہ اتفاقاً انیس کی ایک مجلس میں شرکت ہوئی اور میں بے دلی سے ان کو سننے لگا، لیکن دوسرے ہی بند کی مندرجہ ذیل بیت:

ساتوں جہنم آتشِ فرقت میں جلتے ہیں
شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں

انھوں نے اس انداز سے پڑھی کہ مجھے شعلے بھڑکتے ہوئے دکھائی دینے لگے، اور میں ان کا پڑھنا سننے میں ایسا محو ہوا کہ اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا، یہاں تک کہ جب ایک دوسرے شخص نے مجھے ہوشیار کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں کہاں ہوں اور کس عالم میں ہوں۔" ("انیسیات")

شاد انیس کو پہلی بار سننے سے کچھ دن پیشتر ان سے مل چکے تھے۔ انھیں انیس کے رویے میں سرد مہری محسوس ہوئی تھی اور شاد ان سے کبیدہ خاطر تھے اس لیے شروع کی مجلسوں میں ان کو سننے بھی نہیں گئے۔ چوتھی محرم کو واہ کا شور سن کر وہ انیس کی مجلس کے بیچ میں پہنچے۔ بتاتے ہیں کہ اس وقت "میر صاحب یہ بند پڑھ رہے تھے:

"وہ دشت اور وہ خیمۂ زنگار گوں کی شان"

"وہ دشت" کو سریلی آواز سے ایسا کھینچا کہ وسعت دشت کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اللہ اللہ! وہ لفظوں کا ٹھہراؤ، وہ لب و لہجہ، وہ سریلی دل کش آواز، وہ لبوں پر مسکراہٹ، غرض کہ کس بات کو کہوں۔ اس وقت میر انیس کی جو بات تھی کلیجے کے اندر اتری جاتی تھی۔ وہ میر انیس ہی نہ تھے جن کو چند دن پہلے دیکھا تھا...... چہرے سے لے کر صف آرائی، رخصت، لڑائی، شہادت، بین، سب پورا پڑھا۔ آخر پسینے سے کرتا بدن میں، ٹوپی سر پر بھیگ کر چپک گئی۔ ہاتھ تھام کر منبر سے اتارے گئے...... سیدھے فرودگاہ کی طرف بڑھے۔ میں بھی ننگے پاؤں حیرت زدہ ساتھ ہولیا۔" ("فکر بلیغ" 53-252)

مجلسوں میں انیس کو سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کا کلام سحر کا اثر پیدا کر رہا ہے یا اس کلام کے ادا کرنے کا انداز۔ انھیں ایک طرف انیس کی خوانندگی مدتوں یاد رہتی تھی دوسری طرف وہ کلام جسے پڑھ کر وہ لوگ بھی جنھوں نے اسے انیس کی زبان سے نہیں سنا، تصور کر سکتے ہیں کہ سامعین پر یہ کلام کیا اثر کرتا ہوگا۔ مولوی ذکاء اللہ نے آزاد سے یہ بھی کہا تھا کہ اس مجلس میں انیس کے "کمال اور کلام کی کیا کیفیت بیان کروں۔ محویت کا عالم تھا۔"

منبر پر پہنچ کر انیس میں کچھ شاہانہ انداز پیدا ہو جاتا اور ان کی نازک مزاجی بہت بڑھ جاتی تھی جس کے متعدد واقعات بیان ہوئے ہیں۔ احسن لکھتے ہیں:

"ان کے غصے کے وقت بڑے بڑے صاحب اقتدار لوگ آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔ ان کی ایک ڈانٹ نے دو شالہ اوڑھنے والوں کو پائین فرش جوتوں کے پاس بٹھا دیا ہے۔ وہ منبر پر پہنچ کر اپنے جذبات غیظ کو روک نہیں سکتے تھے۔ ان پر ایک عالم محویت طاری ہوتا تھا اور ان کا نشہ کمال ان کو عالم قدس کی اس بلندی پر پہنچا دیتا تھا جہاں سے اہل دول کی شان نہایت پست دکھائی دیتی تھی...... اکثر فرماتے تھے کہ اگر انیس کے مشتاق ہوں گے تو پہلے سے تشریف لا کر...... زحمت اٹھائیں گے، ورنہ بانی مجلس کی خاطر سے آنے والے قدر دان انیس نہیں ہیں اور نہ انیس کو ان کے حفظ مراتب کی ضرورت ہے۔" ("واقعات" 89-88) میر معصوم علی سوز خوان کا بیان ہے کہ لکھنؤ کے ایک امیر کبیر محفلوں میں خدم و حشم اور رئیسانہ ٹھاٹھ کے ساتھ جاتے تھے۔ ایک بار انیس کی ایک مجلس کے بیچ میں "وہ تشریف لائے اور منبر پر قریب جا کر بیٹھے...... دستور کے مطابق ان کا پھنڈی خانہ، آب دار خانہ اور دست لچے وغیرہ بھی آنا شروع ہوا۔ اس میں دیر ہوئی۔ میر صاحب خاموش مگر غصے میں بیٹھے رہے۔ اسی اثنا میں حاضرین مجلس میں سے کسی نے کہا، جناب میر صاحب، بسم اللہ، آپ مرثیہ شروع فرمائیں۔ انیس نے جھلا کر جواب دیا، کیا شروع کروں، آپ کا جہیز تو آ لے۔" (نوشتۂ ادیب)

احسن یہ بھی بتاتے ہیں کہ "قدر دان سخن میر انیس کی ان بے اعتنائیوں کی پروانہ کرتے تھے" اور اس سلسلے میں یہ واقعہ بیان کرتے ہیں:

"دوران مرثیہ خوانی میں ایک رئیس مجلس میں تشریف لائے اور چاہا کہ کسی طرح مجمعے کو طے کر کے منبر کے قریب پہنچ جائیں۔ میر صاحب ارادہ سمجھ گئے اور اپنی رعب دار آواز سے فرمایا کہ بس، وہیں بیٹھ جاؤ۔ ایک قدم آگے نہ بڑھانا۔ رئیس صاحب نے وہیں غوطہ مارا اور جوتیوں کے پاس آرام سے بیٹھ گئے۔"

("واقعات" 89)

ایک اور واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

"چوک میں میر صاحب کی مجلس تھی۔ بعض رؤسا جو بہ سبب مجلس کے بھرے ہونے کے پائین میں بیٹھے تھے، کسی شدید ضرورت کے پیش آنے کے سبب چپکے عین اس وقت جب میر صاحب جوش میں پڑھ رہے تھے، مجلس سے اٹھ گئے، آپ نے مرثیہ روک کر کہا کہ لکھنؤ میں سخن فہمی اور قدر شناسی کا مادہ نہ رہا۔ ہر چند اصرار ہوئے مگر پھر نہ پڑھا اور اتر آئے۔" ("مرثیہ خوانی کا فن" 101)

ایک عشرے کی مجلسیں انیس منبر کے دوسرے زینے پر بیٹھ کر پڑھ رہے تھے اس لیے منبر سے دور بیٹھنے والوں کو وہ ٹھیک سے نظر نہیں آتے تھے۔ لوگوں کی خواہش تھی کہ وہ کم سے کم ایک زینہ اوپر بیٹھ کر تیسرے زینے سے مجلس پڑھیں، لیکن انیس اس کے بجائے ایک زینہ نیچے اتر کر بیٹھ گئے۔" اور اس روز حاضرین کو پہلے زینے ہی سے مجلس سننی پڑی۔"

(دکن میں مرثیہ اور عزاداری)

منبر پر انیس کی یہ نازک مزاجیاں زیادہ تر امیروں کے طبقے کے ساتھ تھیں۔ ایک طرف وہ دو شالہ اوڑھنے والوں کو ڈانٹ کر جوتوں کے پاس بٹھا دیتے تھے، دوسری طرف، جیسا کہ شبلی نعمانی کو بعض بزرگوں نے بتایا، جو لوگ ان کی مجلس میں جگہ کی کمی کی وجہ سے از خود لب فرش جوتوں کے پاس بیٹھنے لگتے تھے ان کے لیے مناسب جگہ پر بیٹھنے کا انتظام کرتے تھے۔"

("موازنۂ انیس و دبیر" 17)

انیس کی مجلس میں ذرا بھی بدنظمی پیدا کرنے والے ان کے غصے کا نشانہ بنتے تھے، لیکن اس معاملے میں بھی عام سامعین کے ساتھ کبھی کبھی وہ خصوصی رعایت کر جاتے تھے۔ بجنور کے ایک بزرگ سید خورشید حسین بتاتے تھے:

"ایک مرتبہ میں دلا رام کی بارہ دری (لکھنؤ) میں میر انیس کی مجلس سننے گیا۔ مرثیہ شروع ہو چکا تھا۔ مجمع اس قدر تھا کہ میں منبر سے بہت دور پڑ گیا۔ میں نے چاہا کہ مجمع میں گھستا ہوا منبر سے کسی قدر قریب ہو جاؤں مگر مجمعے نے

راہ نہ دی۔ میں مرثیہ سننے کے اشتیاق میں ایسا بے چین تھا کہ بہ آواز بلند خود میر صاحب کو مخاطب کر کے میں نے کہا کہ حضور، میں دور سے آپ کو سننے کے اشتیاق میں آیا ہوں۔ یہ لکھنؤ والے تو روز آپ کو سنا کرتے ہیں۔ مجھ کو یہ موقع کہاں نصیب ہے، مگر یہ لوگ مجھ کو جگہ نہیں دیتے کہ میں آپ سے کچھ قریب ہو جاؤں۔ یہ سن کر میر صاحب نے مرثیہ روک لیا اور مجھ سے فرمایا کہ آیئے، تشریف لایئے۔ جب تک میں منبر کے قریب نہ پہنچ گیا انھوں نے پڑھنا شروع نہ کیا۔" (بیان نوشتہ ادیب)

ایک اور واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ قصبہ زید پور کے دو صاحب لکھنؤ میں انیس کی ایک مجلس سننے پہنچے۔ مجمع بہت تھا۔ دونوں مکانِ مجلس کے صحن کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہوگئے۔ ان میں ایک صاحب شہری تکلفات سے زیادہ واقف نہیں تھے، ان کے ساتھی نے انھیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ انیس کی مجلس ہے، بس چپ چاپ کھڑے سنتے رہنا، لیکن کچھ دیر بعد وہ صاحب بیچ کے ایک مصرعے پر بلند آواز سے تعریف کر بیٹھے، حالانکہ ابھی تعریف کا محل نہیں آیا تھا اور پوری مجلس اگلے مصرعے کے انتظار میں خاموش تھی۔ مجمعے میں یہ تنہا بے موقع آواز بلند ہوئی تو انیس نے مرثیہ روک دیا، آواز کی طرف دیکھا، پھر دونوں صاحبوں کو قریب بلا کر منبر کے سامنے بٹھوایا اس کے بعد پڑھنا شروع کیا۔
(مسموع از ڈاکٹر سید محمد حیدر زید پوری)

انیس کو منبر پر پڑھتے سننا اور ان کی خوانندگی کے انداز کو دیکھنا ایسا تجربہ ہوتا تھا کہ لوگوں کے ذہن میں زندگی بھر تازہ رہتا تھا اور وہ آئندہ کبھی اس کا ذکر کرتے تو یہ اعتراف بھی کرتے تھے کہ اس وقت کی کیفیت زبان یا قلم سے بیان نہیں کی جاسکتی۔ انیس کے پڑھے ہوئے کچھ بَینیہ بند نقل کر کے شاد لکھتے ہیں:

"مجلسوں میں ان بندوں کے پڑھے جانے پر میں نے جیسے جیسے کہرام دیکھے ہیں ان کو کیا بیان کروں" ("فکرِ بلیغ" 322)

اشہری بھی لکھتے ہیں: "میں نے جناب میر انیس نور اللہ مرقدہ کو لکھنؤ میں مرثیہ پڑھتے دیکھا ہے۔ ان کے اعجاز فصاحت کے اظہار سے میری زبان قاصر ہے۔" ("حیاتِ انیس" 37)

ایک بزرگ علی مرزا نے احسن کو بتایا کہ جب کوئی بَینیہ بند پڑھتے میں انیس پر خود بھی رقت طاری ہونے لگتی تھی جو مرثیہ پڑھنے میں مانع ہوتی تھی تو وہ گریہ ضبط کرنے کے لیے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیتے تھے اور ان کا داہنا رخسار پھڑکنے لگتا تھا، لیکن ان کی یہ ادا اہلِ مجلس کو رقت سے بے تاب کر دیتی تھی۔ احسن بتاتے ہیں کہ علی مرزا "یہ نقل میرے سامنے بیان کرتے اور روتے جاتے تھے۔ فرماتے تھے واللہ اس وقت آنکھوں کے سامنے وہ تصویر پھر رہی ہے۔ میں نے کہا کہ کچھ اور حالات میر صاحب کے آپ کو معلوم ہوں تو فرمایئے۔ جواب دیا کہ کیا بتاؤں اور کیا سناؤں۔ دل نے جو کچھ ان کی صحبت اور شاعری کے مزے لیے ہیں زبان ان کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ پھر خاموش ہو رہے۔" ("واقعات" 32)

انیس کے بَینیہ بندوں پر برپا ہونے والے کہرام کے ذکر میں شاد یہ بھی بتاتے ہیں کہ "روتے روتے آٹھ آٹھ آدمیوں کو غش آگئے۔" مولوی باقر حسین بھی انیس کی ایک مجلس کے بیان میں بتاتے ہیں کہ "غل سے امام باڑے کی چھت پھٹنے کا خوف تھا، جب جناب میر صاحب منبر سے اترے تو آٹھ نو آدمی فرش پر بے ہوش تھے۔" ("طریقت")

پنڈت سندر نرائن مشران کو ان کے لڑکپن میں ایک بوڑھے آدمی نے انیس کی مرثیہ خوانی کا چشم دید حال بتایا تھا کہ ان کے منبر پر جاتے ہی "مجلس میں سناٹا چھا جاتا تھا اور جب وہ پڑھنا شروع کرنے سے پہلے آستین چڑھاتے تھے تو لوگوں کے دل ہلنے لگتے تھے۔ پھر جب وہ مرثیے کا بستہ ہاتھ میں لیتے تھے تو رقیق القلب سامعین کو رقت شروع ہونے لگتی تھی اور بین پڑھتے وقت تو گریہ وزاری اور آہ و بکا کا کچھ ٹھکانا نہ ہوتا تھا۔"
("خطباتِ مشران" 21-20)

یہ بیان انیس کی بین خوانی کے متعلق ہیں جس کا اثر سامعین کی رقت کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ انیس کے کمال کے جوہر بین سے بھی زیادہ مرثیے کے دوسرے اجزا چہرے، آمد، رجز، جنگ وغیرہ میں کھلتے تھے۔ اور ان موقعوں پر ان کے سامعین تعریفیں کرتے کرتے بے آپ ہو جاتے تھے۔

انیس کی مرثیہ خوانی کے بارے میں شیخ حسن رضا کا کہنا تھا کہ "وہ نشست سے بالائے منبر قدرت خدا کے جلوے کی تصویر کھینچتے تھے۔"
("تردید موازنہ" 108)

آزاد نے انیس کی آواز اور پوری ہیئت کو مرثیہ خوانی کے فن کے لیے "ٹھیک اور موزوں" بتایا ہے۔ حکیم شفا الدولہ کے داماد نواب مرزا دلاور حسین نے انیس کو پڑھتے دیکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا:

"مرثیہ پڑھنے کا کیا ذکر، انیس کی طرح منبر پر بیٹھنا کسی کو نہیں آیا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ منبر کے اوپر تشریف فرما نہیں ہیں بلکہ منبر ہی سے اُگ کر باہر نمودار ہو گئے ہیں۔" (مضمون "میر علی محمد عارف")

انیس کی مرثیہ خوانی میں ان کا کلام، ان کا لب و لہجہ، ان کی آواز، چہرے کے تاثرات اور اشارات، یہاں تک کہ منبر اور مکانِ مجلس بھی، ان کی ظاہری ہیئت میں مل کر ایک ہو جاتے تھے۔ جب تک وہ مرثیہ پڑھتے رہتے، سننے والے خود کو کسی دوسری دنیا میں پاتے اور انیس انھیں کوئی ورائے فطرت وجود یا کم سے کم ایک عجوبہ معلوم ہوتے تھے۔ یہ انیس کی فنی شخصیت تھی جو قریب نصف صدی تک لوگوں کو منبر پر نظر آتی رہی اور اکثریت انیس کی اسی شخصیت سے آشنا تھی۔ لیکن لوگوں کو یہ تمنا ضرور رہتی تھی، جس طرح آج ہم کو

رہتی ہے، کہ اس منبری شخصیت کے ساتھ ساتھ ہم انیس کی دوسری، سماجی اور گھریلو، شخصیت سے بھی آشنا ہو جائیں۔

انیس کو قدرت کی طرف سے غیر معمولی آواز ملی تھی جو مدھم اور بلند ہونے پر بلکہ پکار کی صورت میں بھی یکساں دلکش رہتی تھی اور اس کے پردے جو ہر ان کی مرثیہ خوانی کے وقت منبر پر کھلتے تھے جہاں ان کو مختلف لہجوں اور آواز کی مختلف سطحوں سے کام لینا ہوتا تھا اور ان کی آواز ہر سطح پر ان کے لہجے اور موضوع کے ساتھ ہم آہنگ رہتی تھی۔ بھاری اور گونجیلی آواز میں یہ صفت پیدا ہونا مشکل ہے۔ میر عبدالعلی نے ادیب کو بتایا تھا کہ انیس کی آواز ''سبک اور تیز تھی۔'' انیس کے شاگرد سید آغا میر کے بیٹے سید محمد جعفر نے انیس کو بارہا دیکھا اور بولتے سنا تھا۔ انھوں نے ادیب کو بتایا کہ ''میر انیس کی آواز میں جو دلکشی تھی وہ کسی انسان کا کیا ذکر، کسی خوش الحان پرند اور کسی باجے کی آواز میں بھی نہیں ہے۔'' (''انیسیات'') احسن بھی انیس کی ''سریلی آواز'' کو یاد کرتے اور بتاتے ہیں کہ ان کی ''آواز میں ایک قسم کا لحن تھا'' (''واقعات'' 33)۔ شاد کو بھی انیس کی ''سریلی آواز'' نے مسحور کر لیا تھا۔ انیس کے لڑکپن کے دوست میر سید محمد کا بیان ہے کہ شروع ہی سے انیس نے ''آواز سریلی پائی تھی۔'' (''فکر'' 226) حیدرآباد کی مجلسیں انیس نے قریب ستر سال کی عمر میں پڑھی تھیں۔ اس وقت بھی ان کی آواز زیادہ بلند تو نہ تھی لیکن سننے والوں کا بیان ہے کہ وہ بڑے ہی خوش الحان تھے۔ ان کی آواز سریلی، میٹھی اور رس بھری تھی۔ خاموشی چھائی رہے تو دور دور تک سنائی دیتی تھی۔''

(''حیدرآباد دکن میں میر انیس کی مجلسیں'')

انیس کی خوش آوازی کے ذکر میں سید محمد جعفر نے ادیب کو یہ بھی بتایا تھا:

''جب کبھی وہ بے تکلف احباب کی صحبت میں کمرے کے اندر دروازے بند کر کے اپنے دادا امیر حسن کی مثنوی بلند آواز سے پڑھتے تھے تو راہ گیر کھڑے ہو کر دیر دیر تک سنا کرتے تھے۔

خوش آوازی کے ساتھ انیس کی خوش گفتاری کے بھی کئی بیان ملتے ہیں لیکن ان کی کم سخنی کا بھی ذکر ہوا ہے۔ آزاد نے لوگوں سے بھی سنا کہ وہ ''کم سخن تھے'' اور خود بھی ان سے مل کر یہی تاثر قائم کیا۔ آزاد یہ بھی بتاتے ہیں کہ انیس کی ''باتیں خط اعتدال سے بھی نیچے نیچے رہتی تھیں۔''

احسن نے انیس کی کم گفتاری اور اس کے قیاسی اسباب کے ذیل میں خاموشی کے موضوع پر خاصی لمبی گفتگو کی ہے اور انیس کے بارے میں لکھا ہے کہ ''خاموش تھے'' اور ''زبان سے کم اور قلم سے زیادہ کام لیتے تھے''

(''واقعات'' 39)

شاد بھی بتاتے ہیں کہ انیس ''اکثر خاموش رہتے تھے۔'' (''فکر بلیغ'' 367) اور انیس سے اپنی پہلی ملاقات کے حال میں بتاتے ہیں کہ مونس (جو انیس کے ساتھ لکھنؤ سے آئے تھے) سفر کے حالات بیان کرتے رہے، ''میر انیس بہ ضرورت کچھ بول کر خاموش بیٹھے رہے۔'' اسی صحبت میں شاد نے خاص طور پر انیس سے داد حاصل کرنے کی خواہش میں اپنی ''کئی غزلیں پڑھیں۔'' ''میر مونس مرحوم برابر داد دیتے رہے، مگر میر صاحب بہ یک زانو چپ بیٹھے سنتے رہے، کچھ نہ بولے۔'' (''فکر بلیغ'' ۔251)

انیس نے خود بھی اپنی خاموشی کی طرف اشارے کیے ہیں۔ مثلاً ''اک مہر گویا لب خاموش پہ ہے''، ''سمجھے جو زبان بے زبانی تو کہوں جو مجھ کو مزہ ملا ہے خاموشی میں۔''

کم بولنے اور بلاضرورت نہ بولنے کی وجہ سے بعض لوگوں کو انیس کے مزاج میں روکھے پن کا شبہ ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ بولتے تو ان کی گفتگو بھی ان کی خوانندگی کی طرح سننے والوں کی پوری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ اسی لیے ہم کو انیس کو کم گفتاری سے زیادہ خوش گفتاری کے بیان ملتے ہیں۔ منیر حامد علی بتاتے ہیں:

''میر انیس نہایت خوش گفتار تھے۔ جب کسی صحبت میں وہ گفتگو کرنے لگتے تھے تو کوئی شخص کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔''

(''انیسیات'' 64)

آزاد انیس کی کم سخنی کے ذکر کے ساتھ یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ جب ''بولتے تو وہ فقرہ کہ موتی کی طرح ٹانکنے کے قابل''، اور ان کا ''ایک ایک لفظ کانٹے کی تول ہوتا تھا۔'' (''آب حیات'')

شریف العلما نے بھی انیس سے گفتگوؤں کے بعد اپنے بھائی کو لکھا:

''میر انیس نہایت خوش تقریر ہیں کہ آدمی محو ہو جاتا ہے۔ اگر کچھ بات کرنے لگتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے۔''

(''میر انیس کا سفر دکن'')

انیس میر حامد علی کی شادی کے انتظام میں شریک تھے۔ ''جب دسترخوان بچھا اور لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو میر صاحب نے بعض بہت با تکلف مہمانوں کے پاس جا جا کر ان کو اپنی باتوں میں ایسا محو کر لیا کہ وہ اپنا تکلف بھول گئے اور زیادہ کھانا کھا گئے۔'' (''انیسیات'' 64)

انیس کے بیان میں آ کر ہر بات دل نشین اور دل چسپ ہو جاتی تھی جیسا کہ شریف العلما کے خط سے ظاہر ہے۔ اشہری بھی یہی لکھتے ہیں:

''ان کی معمولی باتوں میں ادائے کلام سے اعجاز فصاحت کا اثر ظاہر ہوتا تھا اور وہ معجز بیانی ان کا حصہ تھی جو دوسری جگہ نہ مل سکتی تھی اور ان پر ختم ہو گئی جس کو ان کے دیکھنے والے آج بھی یاد کرتے اور نہ دیکھنے والوں کو محو حیرت بناتے ہیں۔'' (''حیات انیس'')

□□□

ایم نسیم اعظمی

ایئروناٹیکل انجینئرنگ کی تعلیم

ایئروناٹیکل انجینئرنگ (AIRONOETICAL ENGG.) عصر حاضر کا سب سے کارآمد اور پرکشش انجینئرنگ کا شعبہ ہے کیونکہ عالمیت نے تمام فاصلاتی اور جغرافیائی حدود کو توڑ کر ساری دنیا کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ اب انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آمدورفت اور نقل وحمل کے ذرائع اور وسائل میں بھی نت نئی تبدیلیاں آرہی ہیں اور یہ ترقی یافتہ ہورہی ہیں۔ عصر حاضر میں ہوائی نقل وحمل کو بھی فضائی کیریئر کے روپ میں دیکھا جانے لگا ہے۔

ایئروناٹیکل انجینئرنگ کا میدان تجارت، ایئر کرافٹ، میزائل اور اسپیس شپ وغیرہ کے فروغ اور تحقیقاتی کاموں کے لیے روز بروز اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ مصنوعی سیارچہ (سیٹیلائٹ)، میزائل ڈیزائننگ، کنسٹرکشن ڈیولپمنٹ وغیرہ میں بھی یہ کافی مفید ثابت ہو رہی ہے جس سے ایئروناٹیکل انجینئرنگ کے لیے ایئر لائن سروس، ایئر کرافٹ، تعمیری یونٹوں، حفاظتی دستوں، فضائیہ (ایئر فورس) اور ہندوستانی خلائی تحقیقی اداروں میں اچھی باوقار اور پرکشش تنخواہ والے باعزت عہدوں پر تقرری کے بہترین مواقع پائے جاتے ہیں۔

ایئروناٹیکل انجینئروں کے لیے عموماً شہری ہوابازی (سول ایوی ایشن) میں کل پرزے، الکٹریکل اور الکٹرانیکل آلات کے رکھ رکھاؤ، ہوائی جہاز سے متعلق ریڈیو اور راڈار کی آپریٹنگ وغیرہ کے بھی کام کرنے ہوتے ہیں۔ بعض ایئروناٹیکل انجینئر میکینیکل اور الکٹرانیکل شاخوں سے بھی آتے ہیں جو انجن اور ہوائی جہاز کے ڈھانچوں، مرمت اور رکھ رکھاؤ کے کاموں میں اپنی فنی اور تکنیکی ہنرمندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جب کہ فلائنگ انجینئر اڑان سے قبل کی جانچ پرکھ اور معائنہ وغیرہ کے ذمے دار ہوتے ہیں اور اڑان کے دوران جہاز کو ہر حال میں بہتر رکھنے کی خدمات انجام دینے پر مامور ہوتے ہیں۔ جہاز کے تمام حصوں اور کل پرزوں کی جانچ پڑتال کے بعد اس میں پائی جانے والی کمیوں اور خامیوں کی نشان دہی کر کے متعلقہ شعبوں کو مطلع کرنے اور نقصانات کی درستگی وغیرہ کی بھی ذمے داری ہوتی ہے۔

ایئروناٹیکل انجینئر بننے کے لیے امیدوار کا ایئروناٹیکل انجینئرنگ میں گریجویٹ ہونا ضروری ہوتا ہے اور اس کے لیے امیدوار کو ایئروناٹیکل سوسائٹی آف انڈیا کے ذریعے منعقد ممبر شپ کے اہلیتی امتحان میں کامیابی حاصل کرنا بھی لازمی ہے جس کے لیے الکٹرانک اور میکینیکل انجینئرنگ میں مہارت یا کم از کم طبیعیات میں گریجویٹ ہونا ضروری ہوتا ہے۔

ایئروناٹیکل انجینئرنگ کی تعلیم وتربیت کے لیے امیدوار کا بارھویں پاس ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ امیدوار کو داخلہ امتحان جے.ای.ای. (JEE) میں بھی کامیابی حاصل کرنی ہوتی ہے جس کا ہر سال دسمبر یا جنوری میں ابتدائی جانچ (Preliminary Test) اور مئی میں خاص امتحان (Main Exam) منعقد ہوتا ہے جس میں کامیابی کے بعد ہی امیدوار ایئروناٹیکل انجینئرنگ کے کورس میں باقاعدہ داخلے کا مجاز ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ الکٹرانکس اور میکینیکل برانچ کے طلبہ بھی بعض ضروری ضابطوں کی تکمیل کے بعد اس میں داخلہ لے کر تعلیم وتربیت حاصل کر سکتے ہیں۔

ایئروناٹیکل انجینئرنگ کی تعلیم وتربیت کا ڈگری کورس چار سال پر مشتمل ہوتا ہے اور بی.ای. ایئروناٹیکل انجینئرنگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں پوسٹ گریجویٹ اور پی.ایچ.ڈی تک تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایئروناٹیکل انجینئرنگ کی تعلیم وتربیت کے لیے امیدوار کا محنتی، ذہین، فعال اور حاضر دماغ ہونا ضروری ہے۔

دی ایئروناٹیکل سوسائٹی آف انڈیا کے ذریعے منعقدہ ایسوسی ایٹ ممبر شپ کے اہلیتی امتحان کے کل تین مراحل ہوتے ہیں (1) اسٹوڈنٹ شپ، (2) سیکشن اے، (3) سیکشن بی۔ دسویں پاس امیدوار اسٹوڈنٹ شپ کورس میں داخلے کے مجاز ہوتے ہیں جب کہ بارھویں پاس طبیعیات، کیمیا اور ریاضی مضامین کے ساتھ امیدوار انجینئرنگ ڈپلوما کے سیکشن اے میں داخلے کے اہل ہوتے ہیں اور سیکشن اے کا کورس مکمل کرنے کے بعد گریجویٹ کی سند والے براہ راست ممبر شپ کے سیکشن بی میں داخلے کے اہل ہو جاتے ہیں۔ اس سوسائٹی کے ذریعے ایئروناٹیکل انجینئرنگ کا فاصلاتی کورس بھی کیا جاسکتا ہے۔ پتہ درج ذیل ہے:

ایئروناٹیکل سوسائٹی آف انڈیا، 31 دی، اندر پرستھ اسٹیٹ، نئی دہلی۔

مذکورہ بالا سوسائٹی ایئروناٹیکل انجینئرنگ کے طلبہ کو درج ذیل اداروں میں عملی اور تجرباتی تربیت کا بھی بندوبست کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بہتر تعلیم وتربیت کے لیے دیگر سہولیات بھی مہیا کراتی ہے۔

(1) اسکول آف ایئروناٹیکل انجینئرنگ۔ 25173 پالم، نئی دہلی-45

(2) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایرونائیکل انجینئرنگ۔ 215/1 کالی داس روڈ، دہرہ دون، اترانچل۔

ایرونائیکل انجینئروں کے لیے مختلف ایئر لائنوں جیسے ایئر انڈیا، انڈین ایئر لائنس، یون فس، ہیلی کاپٹر کارپوریشن آف انڈیا، فلائنگ کلب اور دیگر پرائیوٹ ایئر لائنوں میں سرکاری نجی ایئر سروسوں میں بہتر روزگار کے مواقع ہیں۔ اس کے علاوہ ایئر ونائیکل انجینئرنگ کے مختلف اداروں میں تعلیم و تربیت کی خدمات انجام دینے کے لیے بھی اچھی ملازمت کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً نیشنل ایرونائیکل لیب، ایرونائیکل ڈیولپمنٹ، اسٹیبلشمنٹ، ایروکرافٹ مینوفیکچررس اور ہندوستان ایرونا ٹکس لمیٹڈ وغیرہ۔

ایرونائیکل انجینئروں کی سب سے زیادہ فوجی وغیر فوجی مانگ وزارت ہوابازی اور دیگر ہوائی و فوجی تحقیقاتی اداروں، تجربہ گاہوں، ورک شاپوں میں مختلف تحقیقاتی و ترقیاتی کاموں کے لیے ہوتی ہے۔ جہاں ایرونائیکل انجینئرنگ میں ڈگری، ڈپلوما حاصل کرنے والوں کی بحیثیت ٹیکنیشین کے مختلف عہدوں پر تقرر کیا جاتا ہے۔ آج کل نجی ہوائی ٹیکسوں کی تعداد میں تیزی سے ہونے والے اضافے اور ایئر اسپیس اور اس میں ہونے والی توسیع نے بھی ایرونائیکل انجینئروں کے لیے روزگار کے نئے امکانات پیدا کر دیے ہیں جس سے انجینئرنگ کا یہ شعبہ طلبہ اور سرپرستوں کی توجہ کا خاص مرکز بن گیا ہے۔

ایرونائیکل انجینئرنگ کی تعلیم و تربیت مندرجہ ذیل اداروں میں دی جاتی ہے۔

(1) چار آئی آئی ٹی ادارے جو ممبئی، کانپور، چنئی، کھڑگ پور، میں واقع ہیں۔
(2) اسکول آف ایوی ایشن سائنس اینڈ ٹیکنا لوجی، دلی فلائنگ کلب، صفدر جنگ ایئر پورٹ، نئی دہلی۔ 110003
(3) مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنا لوجی، چنئی 600044۔ یہاں ایرونائیکل انجینئرنگ کے نصاب میں طبعیات اور ریاضی کے مضامین بھی شامل ہیں۔
(4) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس، بنگلور (کرناٹک) یہاں ایئر ونائیکل انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی تک کی تعلیم حاصل کرنے کی سہولت ہے۔
(5) پنجاب انجینئرنگ کالج، چنڈی گڑھ۔ 160011
(6) نہرو کالج آف ایرونائیکل اینڈ اپلائڈ سائنس، کوئمبتور۔
(7) وی۔ایس۔ایم۔ ایرواسپیس، چیلی کیری، بنگلور۔ 560008

□□□

Doman Pura (Kasari), Mau (U.P.) 275101

ہری بھری دنیا کے لیے

مصنف: ایپا سکینہ / مترجم: طلعت گل
ایک دلچسپ سائنس فکشن جس میں دوسری دنیا کی مخلوقات کے ساتھ مل کر ہماری دنیا کے بچے ایک مہم پر روانہ ہوتے ہیں اور اس میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔
صفحات: 118، قیمت: -/28 روپے

شہر میں ایک جنگل

مصنف: کارن ست سلام / مترجم: عباس آصف
چنئی (مدراس) غالباً دنیا کا واحد شہر ہے جس کی حدود کے اندر حقیقی معنوں میں جنگل کا وجود ملتا ہے۔ اس کتاب میں آئی آئی ٹی چنئی کے جنگل میں مصنف اور اس کے دوستوں نے جو تجربے کیے انھیں افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب سے جنگل کے چرند پرند اور دیگر حشرات الارض کے ساتھ ساتھ مختلف قدرتی اشیا سے متعلق بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔
صفحات: 75، قیمت: -/19 روپے

نسوما

مصنف: معصومہ مالک / مترجم: اقبال مہدی
سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہماری دنیا کو نت نئی تبدیلیوں سے ہمکنار کر رہی ہے۔ بیل گاڑی سے ترقی کر کے آج انسان مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ اس کتاب میں ان ترقیات کے پیش نظر اب سے ایک ہزار سال بعد کی دنیا کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔
صفحات: 102، قیمت -/23 روپے

مکمل موصلیت

مصنف: دلیپ ایم سالوی / مترجم: گوہر رضا
مکمل موصلیت (سپر کنڈکٹیوٹی) دورِ جدید کی ایک اہم ایجاد ہے جس سے برقی توانائی کے میدان میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ اس کتاب میں مکمل موصلیت سے متعلق تمام تفصیلات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ایجاد کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے۔
صفحات: 24، قیمت: 10 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

اسمت جین، سمراٹ شرما، سوربھ بنرجی "مائکروسافٹ پاور پوائنٹ" سے اقتباس

آبجکٹس کا اضافہ

آپ اپنے سلائڈ میں کئی چیزیں بنا سکتے ہیں اور ان میں رنگ بھی بھر سکتے ہیں۔ آیئے کچھ تصویروں اور دیگر ملٹی میڈیا کے اضافے کی بھی کوشش کریں۔

کلپ آرٹ پکچر کا اضافہ

کلپ آرٹ گرافکس فائلوں کا مجموعہ ہے۔ کلپ آرٹ ڈرائنگ کا انسرٹ کرنا سلائڈ شو میں توسیع کا بہترین ذریعہ ہے۔ آپ کی پریزنٹیشن کے سلیکٹ کیے ہوئے سلائڈس میں اس آرٹ ورک کا استعمال آپ کے خاص پوائنٹس اور لطف میں اضافے کا باعث ہوگا اور آپ کے پریزنٹیشن کو شائقین کے لیے مزید دلچسپ بنائے گا۔ پاور پوائنٹ میں کلپ آرٹ کی پوری لائبریری موجود ہے۔ مائکروسافٹ کا کلپ آرٹ گیلری پکچر ٹیکسٹ آبجکٹس لانے میں آپ کی مدد کرتا ہے جسے آپ اپنے سلائڈ میں ڈال سکتے ہیں۔

سلائڈ میں گیلری کے کلپ آرٹ پکچر کا اضافہ کرنے کے لیے درج ذیل طریقہ اختیار کریں:

اس سلائڈ کو سلیکٹ کریں جس میں آپ کلپ آرٹ کو انسرٹ کرنا چاہتے ہیں۔

انسرٹ مینو کے کلپ آرٹ آپشن کو سلیکٹ کریں۔

مائکروسافٹ کلپ آرٹ گیلری ڈائیلاگ باکس اسکرین پر نمودار ہوگا۔

کلپ آرٹ گیلری کے اندر انواع (categories) کی لسٹ سے کوئی ایک نوع (category) سلیکٹ کریں۔

گیلری کے تمام تصاویر کو اسکرول کریں اور اپنی من پسند تصویر پر کلک کرکے اسے سلیکٹ کریں۔

سلائڈ کے اندر کسی پکچر کو انسرٹ کرنے کے لیے انسرٹ بٹن کو کلک کریں اور ونڈو کو بند کردیں۔

ملٹی میڈیا کا اضافہ

پریزنٹیشن میں ملٹی میڈیا کلپس کو انسرٹ کرانے کا آسان طریقہ:

انسرٹ مینو کے موویز (فلموں) اور ساؤنڈ آپشن کو سلیکٹ کریں۔

ایک فائل سے انسرٹ کریں اور براؤز کرکے دوسرے فائل میں اسے لے جائیں جہاں آپ اسے انسرٹ کرانا چاہتے ہیں اور OK بٹن پر کلک کریں۔

دوسرے ایم ایس آفس آبجکٹس کا اضافہ

ایم ایس آفس ہمیں بہت سے آفس آبجکٹس کا اضافہ اپنی آفس ٹول میں کرنے کی اجازت دیتا ہے جسے ہم چاہتے ہیں۔ اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بآسانی ہم ایم ایس ورڈ ٹیبل، ایم ایس اکسل ورک شیٹ، ہائی پرلنک ٹیبلس اور لسٹوں کا اضافہ اپنے پاور پوائنٹ پریزنٹیشن میں کریں۔ مثال کے طور پر ایک ڈاٹا ٹیبل سلائڈ کے اندر مفید معلومات فراہم کرسکتا ہے۔

پاور پوائنٹ کے ٹیکسٹ ایڈیٹنگ ٹولس ٹیبل بنانے کے ذرائع فراہم نہیں کرتے لیکن آپ کی ضرورت کے مطابق ٹیبل بنانے کے لیے ورڈ یا اکسیل کو استعمال کرنے پر قادر بناتے ہیں۔

ورڈ ٹیبل یا اکسیل ورک شیٹ کو انسرٹ کرنے کے لیے درج ذیل طریقہ اختیار کریں۔

● نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسز سی۔ایس۔آئی۔آر یونٹ نے طلبہ اور عام شائقین میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے "سب کے لیے آئی ٹی سیریز" کے تحت ایسی کتابیں تیار کی ہیں جو کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ قارئین "اردو دنیا" کے لیے اس سیریز کی کتاب "مائکروسافٹ پاور پوائنٹ" سے اقتباس پیش ہے۔

اسٹینڈرڈ ٹول بار کے مائکروسافٹ ورڈ ٹیبل بٹن یا مائکروسافٹ ایکسیل ورک شیٹ بٹن پر کلک کریں۔

سیلس کا ایک ڈراپ ڈاؤن گریڈ نمودار ہوگا جو آپ کو ٹیبل یا ورک شیٹ کے سائز بتانے میں مدد کرے گا۔

جتنی سطر یا کالم آپ چاہتے ہیں اس کی تعداد بتانے کے لیے ماؤس پوائنٹر کو کلک کریں اور ان سیلو کے اوپر سے اسے ڈریگ کریں۔ جو سیل سلیکٹ کریں وہ اب جلی شکل میں دکھائی دے گا اور گریڈ کے نیچے ایک ڈائمنشن بن جائے گا۔

اب ماؤس بٹن کو چھوڑ دیں۔

پاور پوائنٹ آپ کے سلائڈ کے اندر ایک ٹیبل یا اسپریڈشیٹ انسرٹ کردے گا۔

ٹیبل یا ورک شیٹ کے ٹیکسٹ کو بنانے کے لیے درج ذیل امور کو پیش نظر رکھیں:

ٹیبل یا ورک شیٹ کے اس حصے میں کلک کریں جہاں ٹیکسٹ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں یا ٹیبل کے اندر بنے سیلس کے اوپر انسرشن پوائنٹ کو دائیں بائیں لے جانے کے لیے ٹیب دبائیں۔ ایک دوسری سطر میں جانے کے لیے اوپر نیچے والی ایرو کی (Key) کا استعمال کریں۔

ایک سطر سے دوسرے سطر میں جانے اور اسے ایڈیٹ کرنے کے لیے اسٹینڈرڈ ایڈیٹنگ کنوینشن کا استعمال کریں۔

ٹیبل یا ورک شیٹ کو ڈی سلیکٹ کرنے کے لیے ٹیبل کے باہر کہیں بھی خالی جگہ پر کلک کریں یا سلائڈ کے اردگرد گرے رنگ کے حصے پر کلک کریں۔

ٹیبل کے اندر دوبارہ کلک کرکے ٹیبل کے اندر کوئی بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ جب کسی ٹیبل کو ری سلیکٹ کریں گے تو پاور پوائنٹ کا مینو اور ٹول بار آٹومیٹک (از خود) دوبارہ نمودار ہوجائیں گے۔

دیگر آبجکٹس کا اضافہ

قسم قسم کے بہت سے دوسرے آبجکٹس بھی ہیں جن کا اضافہ اپنے سلائڈ میں کرسکتے ہیں۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہوگا کہ:

انسرٹ بٹن پر کلک کریں اور جو آبجیکٹ انسرٹ کرانا چاہتے ہیں اسے سلیکٹ کریں یا صرف آبجیکٹ آپشن کو سلیکٹ کریں اور آپ کے سامنے ایک ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا جو آبجیکٹ کا انتخاب کرنے میں مدد کرے گا۔

آبجیکٹ کو سلیکٹ کریں اور OK بٹن پر کلک کریں۔

□□□

ابتدائی اردو

مرتبین: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ، تبسم تقی

اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ اردو کے طلبہ کو معیاری اردو بولنا، پڑھنا اور لکھنا آجائے۔ کتاب کی تیاری میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ زبان معیاری مگر عام فہم اور آسان ہو۔ جو مشکل لفظ آگئے ہیں، ان کے معنی ہندی اور انگریزی میں دے دیے گئے ہیں۔

صفحات: 97، قیمت: -/24 روپے

آسان اردو شاعری

مرتبین: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ، تبسم تقی

یہ مختصر کتاب اردو کے ان طلبہ کے لیے ہے جو اردو شاعری سے حظ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس میں مستند شعرا کی ایسی نظمیں شامل ہیں جو آسان زبان میں کہی گئی ہیں۔ جہاں جہاں کچھ مشکل الفاظ آگئے ہیں ان کے معنی ہندی اور انگریزی میں دے دیے گئے ہیں۔

صفحات: 32، قیمت -/15 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد فیروز　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　کوئز

اردو زبان وادب

کوئز کے صحیح جوابات بھیجنے والے قارئین کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا جائے گا۔ پہلا انعام 500 روپے، دوسرا انعام 300 روپے اور تیسرا انعام 200 روپے پر مشتمل ہے۔ انعام کے طور پر کونسل کی مطبوعات ارسال کی جائیں گی۔ آپ کے جوابات ہمیں اس مہینے کی 15 تاریخ تک موصول ہو جانے چاہئیں۔ (ادارہ)

(1) وسطی ہند آریائی زبان کا عام نام کیا ہے؟
(الف) شورسینی　(ب) مغربی ہندی
(ج) بندیلی　(د) برج بھاشا

(2) لسانیات کی بنیادی اور اہم شاخ کا اصطلاحی نام بتائیے؟
(الف) صوتیات　(ب) فونمیات
(ج) صرفیات　(د) معنیات

(3) سید سلیمان ندوی اردو زبان کے آغاز کا سہرا کس کے سر باندھتے ہیں؟
(الف) دکن　(ب) پنجاب
(ج) دہلی　(د) سندھ

(4) کبیر کے دوہوں میں کس زبان کا نقش اول نظر آتا ہے؟
(الف) ماگدھی　(ب) اردو
(ج) شورسینی　(د) پنجابی

(5) امیر خسرو کس لیے مشہور ہیں؟
(الف) دوہے　(ب) غزل
(ج) کہہ مکرنیاں　(د) ریختہ

(6) مثنوی "قطب مشتری" کس کی تصنیف ہے؟
(الف) حسن شوقی　(ب) وجہی
(ج) قلی قطب شاہ　(د) ولی

(7) ولی کا دیوان دلی کب پہنچا تھا؟
(الف) 1707　(ب) 1710
(ج) 1719　(د) 1720

(8) ذیل کے شعرا میں سے کون ایہام گو نہیں ہے؟
(الف) شاہ مبارک آبرو　(ب) شاہ حاتم
(ج) شاکر ناجی　(د) مظہر جان جاناں

(9) غزل کس عربی شعری صنف کی دین ہے؟
(الف) مرثیہ　(ب) قصیدہ
(ج) مثنوی　(د) قطعہ

(10) کسی غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں تو اسے کیا کہتے ہیں؟
(الف) شاہ بیت　(ب) مقطع
(ج) مقفّٰی　(د) مطلع

(11) حکیم مومن خاں مومن نے اردو غزل میں کس اچھوتے انداز کی بنیاد ڈالی؟
(الف) تجاہل عارفانہ　(ب) مکر شاعرانہ
(ج) ابہام　(د) ان میں سے کوئی نہیں

(12) ذیل میں سے قصیدے کا کون سا جزو نہیں ہے؟
(الف) تشبیب　(ب) گریز
(ج) مدح　(د) بین

(13) قصیدہ تضحیک روزگار کے شاعر کا نام بتائیے؟
(الف) غلام ہمدانی مصحفی　(ب) مرزا رفیع سودا
(ج) شیخ محمد ابراہیم ذوق　(د) امام بخش ناسخ

(14) "رجز" کس شعری صنف کا جزو ہے؟
(الف) قصیدہ　(ب) نظم
(ج) مثنوی　(د) مرثیہ

(15) مرزا سلامت علی دبیر کس کے شاگرد تھے؟
(الف) میر خلیق　(ب) میر ضاحک
(ج) میر ضمیر　(د) دلگیر

(16) "مسدس" کے ایک بند میں کتنے مصرعے ہوتے ہیں؟
(الف) چار　(ب) پانچ
(ج) چھ　(د) سات

(17) میر حسن کی مشہور مثنوی کا نام کیا ہے؟
(الف) خواب وخیال　(ب) دریائے عشق
(ج) سحرالبیان　(د) قصہ بے نظیر

(18) حالی نے کس شعری صنف کو سب سے زیادہ کارآمد بتایا ہے؟
(الف) نظم　(ب) مثنوی
(ج) غزل　(د) مرثیہ

(19) رباعی کے لیے کتنے اوزان مقرر ہیں؟
(الف) آٹھ　(ب) بارہ

(ج) بیس (د) چوبیس

(20) مجھ کو تھا الہی یا زباں تھی
مجھ سے زیادہ تر رواں تھی
اس شعر میں کون سی صنعت استعمال کی گئی ہے؟
(الف) تلمیح (ب) تضاد
(ج) تشبیہ (د) مجاز مرسل

(21) مرزا غالب اردو شاعری میں کس کے شاگرد تھے؟
(الف) سراج الدین علی خاں آرزو (ب) مرزا عبدالقادر بیدل
(ج) ملا عبدالصمد (د) کسی کے نہیں

(22) "مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔۔۔" غالب نے یہ فقرہ کس کے خط میں لکھا تھا؟
(الف) مرزا تفتہ (ب) مرزا حاتم علی مہر
(ج) مرزا قربان علی بیگ سالک (د) یوسف مرزا

(23) ذیل کی کتابوں میں سے کون سی کتاب رجب علی بیگ سرور کی نہیں ہے؟
(الف) فسانۂ عجائب (ب) عجائب القصص
(ج) سرور سلطانی (د) انشائے سرور

(24) نذیر احمد کا ناول "مراۃ العروس" کب شائع ہوا تھا؟
(الف) 1858 (ب) 1862
(ج) 1869 (د) 1875

(25) رتن ناتھ سرشار کا "فسانۂ آزاد" قسط وار کس اخبار میں شائع ہوا؟
(الف) اردو اخبار (ب) تہذیب الاخلاق
(ج) اودھ پنچ (د) اودھ اخبار

(26) رسالہ "دلگداز" کا مدیر کون تھا؟
(الف) حسرت موہانی (ب) عبدالحلیم شرر
(ج) نیاز فتح پوری (د) نوبت رائے نظر

(27) کس اردو ادیب کو "مصور غم" کہا جاتا ہے؟
(الف) خواجہ حسن نظامی (ب) راشد الخیری
(ج) سلطان حیدر جوش (د) میر ناصر علی

(28) راجندر سنگھ بیدی کے ڈراموں کے مجموعے کا نام کیا ہے؟
(الف) ایک چادر میلی سی (ب) لاجونتی
(ج) سات کھیل (د) دروازے کھول دو

(29) مشہور افسانہ "آخری کوشش" کس کی تحریر ہے؟
(الف) اوپندر ناتھ اشک (ب) علی عباس حسینی
(ج) خواجہ احمد عباس (د) حیات اللہ انصاری

(30) "فردوس بریں" کس کا ناول ہے؟
(الف) عزیز احمد (ب) عبدالحلیم شرر
(ج) صادق سردھنوی (د) سجاد حسین

(31) "افسانے کی حمایت میں" کس کی تصنیف ہے؟
(الف) محمد حسن عسکری (ب) شمس الرحمٰن فاروقی
(ج) وارث علوی (د) اختر اورینوی

(32) "لکھنؤ کی پانچ راتیں" کا مصنف کون ہے؟
(الف) نیر مسعود (ب) علی عباس حسینی
(ج) اختر انصاری (د) علی سردار جعفری

(33) ذیل کے شعرا میں سے کون "رند پارسا" کے نام سے مشہور ہے؟
(الف) امیر مینائی (ب) حسرت موہانی
(ج) اصغر گونڈوی (د) ریاض خیرآبادی

(34) ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس کہاں ہوئی تھی ؟
(الف) لاہور (ب) حیدرآباد
(ج) لکھنؤ (د) بھوپال

(35) "سیف و سبو" کس شاعر کا مجموعۂ کلام ہے؟
(الف) یگانہ چنگیزی (ب) شاد عظیم آبادی
(ج) فراق گورکھپوری (د) جوش ملیح آبادی

(36) ایسی نثر جس کے دو فقروں کے تمام الفاظ ایک دوسرے کے ہم وزن ہوں اور آخری حروف بھی موافق ہوں اس نثر کو کیا کہتے ہیں؟
(الف) سادہ (ب) مرصع
(ج) مقفیٰ (د) دقیق سادہ

(37) "داستان تاریخ اردو" کس نے لکھی تھی؟
(الف) نصیر الدین ہاشمی (ب) گیان چند جین
(ج) حامد حسن قادری (د) محی الدین قادری زور

(38) حالی کی کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" سے اردو میں کس صنف کی ابتدا ہوئی؟
(الف) تذکرہ (ب) تحقیق
(ج) تنقید (د) تبصرہ

(39) "تاریخ سرکشی ضلع بجنور" کس مشہور ادیب کی کتاب ہے؟
(الف) عبدالرحمٰن بجنوری (ب) مولوی بشیر احمد
(ج) سرسید احمد خاں (د) سید سلیمان ندوی

(40) ذیل کی کس کتاب میں مقفیٰ و مسجع عبارت زیادہ ہے؟
(الف) غبار خاطر (ب) فسانۂ عجائب
(ج) فسانۂ آزاد (د) ابن الوقت

(41) کس ادیب نے اردو صحافت میں اعلیٰ درجے کی ظرافت کی بنیاد ڈالی؟
(الف) رتن ناتھ سرشار (ب) اکبر الٰہ آبادی
(ج) منشی سجاد حسین (د) عبدالماجد دریاآبادی

(42) "ورنا کولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کس ادارے نے قائم کی تھی؟

(الف) فورٹ ولیم کالج (ب) جامعہ عثمانیہ

(ج) دہلی کالج (د) محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

(43) جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا
یہ شعر کس کا ہے؟

(الف) حسرت عظیم آبادی (ب) نظم طباطبائی

(ج) حسرت موہانی (د) ظفر علی خاں

(44) "نظم جدید کی کروٹیں" کس کی کتاب ہے؟

(الف) آل احمد سرور (ب) وزیر آغا

(ج) شمس الرحمٰن فاروقی (د) خلیل الرحمٰن اعظمی

(45) اردو میں پہلا رپورتاژ کس نے لکھا؟

(الف) سجاد ظہیر (ب) کرشن چندر

(ج) عصمت چغتائی (د) عادل رشید

(46) مندرجۂ ذیل میں سے کس اردو شاعر کو "گیان پیٹھ ایوارڈ" سے نوازا گیا؟

(الف) مجروح سلطانپوری (ب) فراق گورکھپوری

(ج) کیفی اعظمی (د) شکیل بدایونی

(47) اردو کا پہلا اخبار کہاں سے شائع ہوا؟

(الف) دہلی (ب) لاہور

(ج) حیدرآباد (د) کلکتہ

(48) اقبال کی نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" ان کے کس مجموعے میں ہے؟

(الف) بال جبریل (ب) ضرب کلیم

(ج) پیام مشرق (د) جاوید نامہ

(49) انجمن ترقی اردو ہند کون سا ادبی جریدہ شائع کرتی ہے؟

(الف) ایوان اردو (ب) ایوان ادب

(ج) اردو ادب (د) نیا ادب

(50) مندرجۂ ذیل میں سے کس ناول پر فلم بنی تھی؟

(الف) آگ کا دریا (ب) ٹیڑھی لکیر

(ج) لہو کے پھول (د) امراؤ جان ادا

□□□

ہمیں جولائی کے کوئز انعامی مقابلے کے متعدد صحیح جوابات موصول ہوئے۔

قرعہ اندازی کے بعد درج ذیل حضرات کو بالترتیب اوّل، دوم اور سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

1. ابصار طلعت
رحم گنج، دربھنگہ-846004 (بہار)

2. تحسین احمد
114، چندر بھاگا ہاسٹل، جے. این. یو.،
نئی دہلی-110067

3. قمرالحسن
7816/3، الیاس بلڈنگ، نئی بستی، باڑہ ہندو راؤ،
دہلی-110006

انعام یافتگان کو ادارے کی طرف سے مبارک باد۔
آپ کے انعامات جلد ہی بذریعۂ ڈاک ارسال کردیے جائیں گے۔

(ادارہ)

پچھلے انعامی مقابلے (کوئز) کے صحیح جوابات:

1. الف	2. الف	3. ب	4. الف	5. الف
6. د	7. الف	8. الف	9. الف	10. ب
11. ج	12. الف	13. الف	14. الف	15. ب
16. ج	17. د	18. الف	19. الف	20. ب
21. د	22. ج	23. الف	24. الف	25. ب
26. الف	27. ب	28. الف	29. الف	30. الف
31. ج	32. الف	33. الف	34. ج	35. الف
36. الف	37. الف	38. د	39. ب	40. الف
41. ب	42. ب	43. ج	44. ج	45. ب
46. الف	47. د	48. ب	49. ج	50. ب

طارق کمال خاں

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-25

بڑھتے قدم

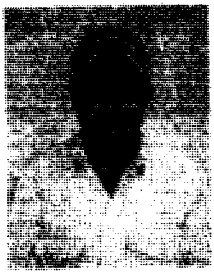

جان عالم کا تعلق شاہجہاں پور اترپردیش سے ہے۔ ان کے والد درزی کا کام کرتے تھے۔ جانِ عالم نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے سرکاری اسکول میں حاصل کی۔ بعد ازاں روہیل کھنڈ یونیورسٹی، بریلی سے بی۔اے۔ کا امتحان پاس کیا۔ انہوں نے قومی اردو کونسل کی جانب سے چلائے جانے والے شہید اشفاق اللہ خاں انفوٹیک سینٹر، احمد پور چنگی، شاہجہاں پور سے کمپیوٹر اپلیکیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کورس کیا اس کے بعد انہیں کلکٹریٹ میں ملازمت مل گئی۔ جانِ عالم سے کی گئی مختصر گفتگو قارئینِ "اردو دنیا" کی نذر ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: کمپیوٹر سے میرا لگاؤ وقت اور حالات کے مدنظر ہوا، میں سمجھتا ہوں کہ آنے والا وقت کمپیوٹر کا ہوگا اور میں زمانے کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، جو کمپیوٹر کی تعلیم کے بعد ہی ممکن ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ یہاں پر ایک ہی وقت میں بہت سارے کورس کروائے جاتے ہیں، یہاں پر تدریسی اوقات بھی زیادہ ہیں، علاوہ ازیں کمپیوٹر پر کام کرنے کا موقع بھی زیادہ ملتا ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے، اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: میں یہاں کی تربیت سے پوری طرح مطمئن ہوں کیونکہ یہاں کے اساتذہ بہت محنتی ہیں اور دلچسپی کے ساتھ طلبہ کو تعلیم و تربیت دیتے ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں سے فارغ طلبہ کو روزگار کے مواقع فراہم ہو رہے ہیں یہ تربیتی مراکز ایسے طلبہ کو روزگار کی فراہمی میں بہت معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: میں قومی اردو کونسل کا بہت شکرگزار ہوں کہ اس کی طرف سے چلائے جارہے کمپیوٹر سینٹروں کی وجہ سے بہت کم وقت میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا ایک اہم حصہ بن گیا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ اس میدان میں زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کروں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خوداعتمادی اور خودانحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: یقیناً میری خوداعتمادی میں اضافہ ہوا ہے اور میں اپنے آپ کو بہت سے لوگوں سے بہتر محسوس کرتا ہوں۔ اس کی بدولت مجھے نوکری اور معاشی آسودگی دونوں حاصل ہوئیں۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ آپ اپنی اس انفرادیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: ملٹی لنگول ہونا بذاتِ خود ایک بہت بڑا اعزاز ہے— اس کے بہت سارے فائدے ہیں خاص طور سے روزگار کے حصول میں یہ بہت کام آتا ہے۔ اگر ایک آدمی اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں کام کرسکتا ہے تو اس کے لیے نوکری کے مواقع اس آدمی سے بہت زیادہ ہیں جو صرف کوئی ایک ہی زبان جانتا ہو۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، اس کی ادائیگی آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: میرے خیال سے جو فیس یہاں پر لی جارہی ہے وہ کسی بھی طالب علم کے لیے بوجھ نہیں ہوسکتی، اور میرے لیے بھی بوجھ نہ تھی۔

□□□

اردو خبرنامہ

پیشہ ورانہ کورس کی اٹھارہ کتابوں کا اردو ترجمہ شائع

● نئی دہلی، 22 رجون۔ قومی اردو کونسل نے پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے این.سی.ای.آر.ٹی. کی تیار کردہ اٹھارہ کتابوں کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ ان کتابوں سے اردو ذریعۂ تعلیم کے طلبہ کو اپنی مادری زبان میں پیشہ ورانہ کورسوں میں تعلیم حاصل کرنے میں آسانی فراہم ہوگی۔ طالب علموں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم کی فراہمی کے منصوبے کے تحت حکومتِ ہند کی وزارت ترقی انسانی وسائل ہندوستانی زبانوں میں کتابوں کی تصنیف، تالیف، ترجمہ اور اشاعت کا اہتمام کرتی ہے۔ اسی منصوبے کے تحت اردو میں بھی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیمی درجات کے لیے این.سی.ای.آر.ٹی. کی تیار کردہ نصابی کتابوں کے ترجمے کا کام قومی اردو کونسل کرتی ہے۔ بدلتے ہوئے سائنسی اور تکنیکی منظرنامے میں یہ ضروری ہے کہ اردو بھی عہد حاضر کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اردو میں تکنیکی اور پیشہ ورانہ علوم پر مبنی کتابیں دستیاب ہوں۔ اسی مقصد کے تحت کونسل نے پیشہ ورانہ، آئی.ٹی.آئی. اور ڈپلوما انجینیرنگ سے متعلق کتابوں کا ترجمہ کرانے کے لیے اولیں قدم اٹھایا ہے اور پیشہ ورانہ کورسوں کی اٹھارہ کتابوں کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ یہ کتابیں مندرجۂ ذیل ہیں:
الیکٹرونکس ٹیکنالوجی، گھر کی وائرنگ کا تعارف، گھریلو برقی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال، نل سازی کا تعارف، اسکوٹر اور موٹر سائیکل (مرمت اور دیکھ بھال)، پاور تھریشر کی دیکھ بھال اور مرمت، فوٹوگرافی، پود حفاظتی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال، لکڑی کی دستکاری، باٹک، بنیادی کھاتہ نویسی، گھریلو اشیا کی دیکھ ریکھ، دودھ اور دودھ سے بنی اشیا، دودھ کی پیداوار اور دیکھ بھال، عام باغبانی، بانس دستکاری، نرم کھلونے اور شہد کی مکھیاں پالنا۔

کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے امید ظاہر کی ہے کہ ان کتابوں کی مدد سے اردو تعلیم کو سائنس، ٹیکنالوجی اور روزگار سے جوڑنے میں مدد ملے گی۔ آئی.ٹی.آئی. اور ڈپلوما انجینیرنگ کی کتابوں کے ترجمے کا کام بھی جاری ہے اور یہ جلد ہی منظر عام پر آجائیں گی۔

راجیو گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف اردو ایجوکیشن کا قیام

● نئی دہلی، 28 رجون۔ اردو زبان کو روزی روٹی سے جوڑنے اور اردو ذریعۂ تعلیم والے طلبہ و طالبات کی اعلیٰ پیشہ ورانہ کورسوں میں داخلے کی دقتوں کو دور کرنے کے لیے راجیو گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف اردو ایجوکیشن کا قیام عمل میں آیا ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ایجوکیشنل میڈیا ریسرچ سوسائٹی (دہلی) کے تحت کام کرے گا۔ اس کے قیام کا اصل مقصد ملک کے دور دراز علاقوں میں رہنے والے نوجوانوں اور بالخصوص مختلف اسباب کی بنا پر اپنی تعلیم جاری نہ رکھ پانے والی لڑکیوں کو پیشہ ورانہ تعلیم مہیا کرانا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ روایتی کورسوں کے علاوہ پیشہ ورانہ کورسوں پر توجہ دے گا اور تمام کورس فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت ہوں گے۔ اس کے تحت روایتی کورسوں کے علاوہ جن پیشہ ورانہ کورسوں کو شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، ان میں ڈپلوما ان ماس کمیونیکیشن اینڈ ٹی وی جرنلزم، ڈپلوما ان ایڈورٹائزنگ اینڈ پبلک ریلیشن، اردو ٹیچرس ٹریننگ کورس، بزنس مینجمنٹ، آفس ایڈمنسٹریشن وغیرہ شامل ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو صحافت کے مسائل پر مذاکرہ

● نئی دہلی، 15 رجون۔ ہندوستان میں اردو صحافت کا دائرہ سمٹتا جا رہا ہے۔ اردو اخبارات کی تعداد اشاعت روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔ اردو آبادی کا بیشتر حصہ اردو اخبارات کو خرید کر نہیں پڑھتا۔ مقررین نے ان خیالات کا اظہار اردو رسالے ''اسپین'' اور دہلی اردو اکادمی کے مشترکہ تعاون سے اردو صحافت کے مسائل کے موضوع پر غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں منعقد ایک مذاکرے میں کیا۔ اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے ممتاز اردو صحافی م. افضل نے کہا کہ بلاشبہ اردو اخبارات کئی مشکلوں سے دوچار ہیں لیکن ان مشکلات سے مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ عبید صدیقی نے کہا کہ اردو زبان کے زیادہ تر اخبارات قارئین کے بحران میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔ اردو جاننے اور پڑھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں اور اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہو کر رہ گئی ہے اس لیے اردو صحافت کا دائرہ بھی سمٹتا جا رہا ہے جو ایک پریشان کن مسئلہ ہے۔ اس کے حل کے لیے سنجیدگی سے غور و فکر کرنا لازمی ہے۔

فیروز بخت احمد نے کہا کہ ہندوستان میں اردو صحافت کی حالت میں بہتری اسی وقت ممکن ہے جب اس کے لیے سنجیدگی کے ساتھ عملی طور پر ٹھوس اقدامات کیے جائیں اور ایسے حالات پیدا کیے جائیں جو مالی وسائل میں اضافے کا سبب بنیں۔

پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ لہٰذا اردو صحافت کو بھی مذہبی رنگ و آہنگ سے دور رکھنا ہی بہتر ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اخبارات کے گیٹ اَپ کو خوبصورت بنانا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

سہیل انجم نے اپنے مقالے میں بتایا کہ اردو صحافت کا مسئلہ براہ راست زبان سے جڑا ہوا ہے۔ اردو صحافت کی ترقی کے لیے صحافیوں کو خالص پیشہ ورانہ رویہ اختیار کرنا ہوگا۔ سرمائے کی کمی دور کرکے اور جدید ترین ٹیکنالوجی کا استعمال

کر کے اردو صحافت کو ترقی یافتہ بنایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے صحافت کے لیے تربیتی مرکز قائم کرنے پر بھی زور دیا۔ برکلے (امریکا) کی کیلی فورنیا یونیورسٹی میں استاد ڈاکٹر محمد جہانگیر وارثی نے ہندوستان میں اردو صحافت کے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو اخبارات میں تعلیم و ترقی کی باتیں کم اور سنسنی خیزی اور اشتعال انگیزی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اس کے سبب عام قاری اخبارات سے دور رہتا ہے۔ انھوں نے مالی وسائل بڑھانے کے لیے اشتہارات اور سرکاری امداد حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ جہاں جہاں اردو مروّج ہے وہاں کے مقامی مسائل کو اخبارات میں جگہ ملے تو قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

اس مذاکرے کی نظامت اسپین کے مدیر انجم نعیم نے کی اور آخر میں اردو اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب میں امریکی سفارت خانے کے کلچرل کونسلر عدنان صدیقی بھی موجود تھے۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

عالمی اردو کانفرنس

● ٹورنٹو، 22 رجون۔ ''اردو زبان کو کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ وہ زندہ اور پہلے سے بہتر حالت میں ہے۔'' ٹورنٹو میں سہ روزہ بین الاقوامی اردو کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ شمالی امریکہ میں اس طرح کی کانفرنس کا اہتمام از خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کا مستقبل روشن ہے۔ نیز اردو کو صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کو ایک عالمی زبان کے طور پر فروغ دینا چاہیے۔ کانفرنس کا اہتمام ''اردو ٹائمز'' نے کیا تھا جس میں ہندوستان، پاکستان، برطانیہ، فرانس اور کینیڈا کے نامور شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے شرکت کی۔ جلسے میں ادب اور جدید رجحانات، اقبالیات، غالبیات، ذرائع ابلاغ کے نئے مبارزات، مذہبی شاعری اور خواتین کے ادب پر مقالے پڑھے گئے۔ مدیر روزنامہ ''سیاست'' (حیدرآباد) جناب زاہد علی خاں نے کہا کہ ریاست آندھرا پردیش میں ہر سال اردو اسکولوں سے 50 ہزار سے زائد طلبہ ترک تعلیم کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ طلبہ کو اسکولوں میں رکھنا بہت ضروری ہے اور اسکول کے معیار کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے شرکا سے اپیل کی کہ وہ ہر سال کم سے کم ایک طالب علم کی ذمے داری قبول کریں۔ نیویارک سے شائع ہونے والے اردو اخبار ''اردو ٹائمز'' کے ناشر خلیل الرحمٰن نے اعلان کیا کہ وہ معیاری اردو کاموں کی اشاعت میں معاونت کریں گے اور ایک بین الاقوامی جیوری ان کاموں کا انتخاب کرے گی۔ کانفرنس میں اردو رسم الخط کی اس کی موجودہ شکل میں تحفظ کے لیے ضروری قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی (کنوینر کانفرنس) نے کہا کہ فارسی عربی رسم الخط اردو زبان کا اٹوٹ حصہ ہے اور اس سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا۔ کانفرنس میں شمالی امریکہ کے سنڈے اسلامک اسکولوں میں اردو کی تدریس کا انتظام کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جلسے میں 1500 افراد نے شرکت کی جس کے بعد مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر شان الحق حقی، ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، وکیل انصاری، مونا شہاب اور دوسرے شعرا نے حصہ لیا۔

(سیاست، حیدرآباد)

دوردرشن کا اردو چینل

● نئی دہلی، 24 رجون۔ پرسار بھارتی آئندہ سال یکم جنوری سے اردو ٹی وی چینل شروع کرے گا۔ وزیر اطلاعات و نشریات جناب جے پال ریڈی نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ اس چینل کے سافٹ ویئر کی تیاری کے لیے 65.7 کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پرسار بھارتی سے حکومت ہند نے اردو ٹی وی چینل شروع کرنے کی درخواست کی تھی جسے منظور کر لیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ شروع میں یہ چینل یومیہ سات گھنٹے کا پروگرام پیش کرے گا۔

جناب ریڈی نے کہا کہ اردو ملک کی ایک اہم اور بڑی زبان ہے۔ دس کروڑ لوگ تو اردو پڑھتے ہیں اور اس سے زائد اسے سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ چینل نئے سال کا تحفہ ہوگا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

الیکٹرانک میڈیا پر ورکشاپ

● میرٹھ، 15 رجون۔ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے انسٹی ٹیوٹ آف جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکیشن میں الیکٹرانک میڈیا پر 10 روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا جس میں نظامت اور صحافت کی باریکیوں سے متعلقہ شعبے کے ماہرین نے طلبہ و طالبات کو آگاہ کیا۔ دوردرشن کے اردو نیوز ریڈر معین شاداب نے پندرہ منٹ کا نیوز بلیٹن خود پڑھا اور خبر پڑھتے وقت پیش نظر رکھنے والی تمام باریکیوں اور نکات پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر معروف فوٹوگرافر سنیل کالیا نے فوٹوگرافی سے متعلق تکنیکی معلومات فراہم کیں۔ اسلم جمشید پوری نے ورکشاپ کے انعقاد کے مقصد کے حوالے سے کہا کہ الیکٹرانک میڈیا کی تکنیکی معلومات حاصل کرنے سے طلبہ و طالبات کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوگا۔ سہارا سے نیوز چینل کے ناظم اور خبر خواں دنیش گوتم اور انوراگ جھا، نریندر مشرا، منوج کمار شریواستو، ظفر گلزار کے علاوہ مشتاق صدف نے بھی اس میں شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

پروفیسر مختار الدین احمد کو استقبالیہ

● نئی دہلی، 9 رجون۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ایوان غالب میں معروف اسکالر اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کے استقبالیہ کے موقعے پر ہریانہ کے گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے پروفیسر مختار الدین احمد کو اس عہد کا اہم دانشور بتایا اور امید ظاہر کی کہ وہ اسی طرح اپنے علمی کاموں میں مصروف رہیں

گے۔ اس سے قبل ڈاکٹر قدوائی نے غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے پروفیسر مختارالدین کو شال، سپاس نامہ اور مالی نذرانہ پیش کیا اور ان کی زندگی اور علمی کارنامے پر لکھی گئی کتاب ''پروفیسر مختارالدین احمد: محقق ودانشور'' کا اجرا کیا۔ اس کتاب میں ہند اور بیرونِ ہند کے ممتاز علما کے مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے پروفیسر مختارالدین کی شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آپ اپنے علم وفن کی وجہ سے پوری ادبی دنیا میں جانے جاتے ہیں اور غالب کے حوالے سے آپ کا کام ہمیشہ عزت کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ جناب شاہد ماہلی نے اس موقعے پر بتایا کہ اس سے قبل آل احمد سرور، آنند نرائن ملا، معین احسن جذبی، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر سید امیر حسن عابدی، پروفیسر نورالحسن ہاشمی اور قاضی عبدالودود جیسے اہم ادیبوں کو یہ اعزاز دیا جاچکا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ مخطوطہ شناسی پر موصوف کی اچھی نظر ہے اور ان کی تحقیق کا طریقہ سائنٹفک ہے۔ مختارالدین احمد کی مرتب کردہ کتابیں آج بھی اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ پروفیسر مختارالدین احمد نے اپنی تقریر میں اس اعزاز کے لیے غالب انسٹی ٹیوٹ کے تمام اراکین کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر سید امیر حسن عابدی نے پروفیسر مختارالدین احمد کو اس اعزاز کے لیے مبارک باد پیش کی۔ (ڈاک سے)

جلسۂ تقسیمِ اسناد

● رانچی، 22 رمئی۔ قومی اردو کونسل کی طرف سے چلائے جانے والے سجاد انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی اور سجاد کمپیوٹر ٹریننگ اینڈ گائیڈنس سینٹر رانچی کا جلسۂ تقسیمِ اسناد وائی ایم سی اے ہال، رانچی میں منعقد ہوا۔ اس موقعے پر جھارکھنڈ اسمبلی کے اسپیکر اندر سنگھ نامدھاری مہمانِ خصوصی تھے اور جھارکھنڈ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین پروفیسر نرمل کمار چٹرجی نے جلسے کی صدارت کی۔ انھوں نے دونوں کمپیوٹر سینٹروں میں اول مقام حاصل کرنے والی یاسمین شہناز (ایس.آئی.آئی.ٹی.) اور رِنکھا سنگھ (ایس.سی.ٹی.جی.سی.) کے علاوہ دیگر کامیاب طلبہ وطالبات کو اسناد اور ایوارڈ دیے۔ اس موقعے پر محمد قیام الدین خاں وائس چیئرمین اقلیتی کمیشن ریاست جھارکھنڈ اور عالمگیر عالم رکن ریاستی اسمبلی بھی موجود تھے۔ اندر سنگھ نامدھاری نے اپنی تقریر میں کہا کہ ٹرسٹ ریاست جھارکھنڈ میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں قابلِ تعریف کام کر رہا ہے۔ نعیمہ خاتون انسٹرکٹر ایس آئی آئی ٹی کے اظہارِ تشکر پر جلسے کا اختتام ہوا۔ (ڈاک سے)

متفرقات

● گوالیار، 12 رجون۔ انجمن ترقی اردو کی مقامی شاخ کی مجلسِ عام کا جلسہ انجمن کے ریاستی سکریٹری وقار صدیقی کی موجودگی میں منعقد ہوا۔ جلسے میں انجمن کے عہدیداروں اور اراکینِ مجلسِ عاملہ کا انتخاب اتفاقِ رائے سے ہوا۔ پروفیسر ونود پرشاد سکسینہ گلزار کو صدر، وجے کلیم اور محترمہ کادمبری آریہ کو نائب صدر، پروفیسر عبدالجمیل قریشی کو جنرل سکریٹری، سہیل احمد قریشی، اٹل اجنبی اور مدن موہن دانش کو سکریٹری اور راجکمار راز کو خازن منتخب کیا گیا۔ وقار صدیقی، ڈاکٹر بھارتیندو شکلا ہمسفر، ڈاکٹر ادریس منصوری، ایم اے خاں، شہناز خاں، پریم بہادر اجے اور رشمی شرما صبا مجلسِ عاملہ کے اراکین منتخب کیے گئے۔ (ڈاک سے)

● امریکا کے موقر ادارے، امریکن بایوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ نے مشہور مورخ، محقق، شاعر اور ایشین پارلیمنٹری رفارم گروپ (لندن) کے صدر نشیں ڈاکٹر وِدیاساگر آنند کو بین الاقوامی سفیر کے خطاب سے نوازا ہے۔ ڈاکٹر آنند نے متعدد تاریخی وتحقیقی کتابیں لکھی ہیں جنھیں علمی حلقوں میں کافی سراہا گیا ہے۔ ان میں دوسری جنگ عظیم میں غیر معمولی قربانیاں دینے والے ہندوستانیوں کی خدمات پر مبنی کلاسیکی دستاویز ''ہیروز اینڈ ہیروئنز ان دی سیکنڈ ورلڈ وار'' اور جدید چین کے بانی ومعمار سن یات سین کے اغوا کی داستان پر مشتمل ''دی کڈنیپنگ آف سن یات سین'' بہت اہم ہیں۔ (ڈاک سے)

● پونے، 25 رجون۔ منور پیر بھائی، چیئرمین، حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے کو نیشنل کمیٹی آف پاکستان انڈیا پیپلز فورم فور پیس اینڈ ڈیموکریسی (انڈیا) کی نیشنل کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان امن ویکجہتی اور جمہوریت کے فروغ کی غرض سے 1994 میں اس فورم کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ منور پیر بھائی اپنی تعلیمی، سماجی اور رفاہی خدمات کی وجہ سے معروف ہیں۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے کورٹ ممبر بھی ہیں۔ (ڈاک سے)

● پونہ۔ اعظم کیمپس پونہ میں ہر سال پورے مہاراشٹر کے ذہین اور قابل طلبہ کا اسکرین ٹیسٹ کے ذریعے انتخاب کیا جاتا ہے اور ایم اے رنگون والا ٹیلنٹ سرچ اینڈ پروموشن اسکیم کے تحت انھیں گیارھویں اور بارھویں کے امتحانات میں شریک ہونے کے لیے خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ اس پروگرام کے روحِ رواں جناب پی اے انعامدار ہیں۔ سالِ رواں میں 175 ذہین بچوں کو خصوصی تربیت دینے کا انتظام کیا گیا۔ اس سال ایچ ایس سی امتحان میں اسّی سے زائد طلبہ وطالبات نے اسّی (80) فیصد سے زائد نمبرات حاصل کیے۔ انصاری دامق پونہ بورڈ کی میرٹ لسٹ میں دوسرے نمبر پر اور سائنس فیکلٹی میں اوّل آئے۔ پٹیل شمشیر امیر نے بارھویں پوزیشن حاصل کی۔

اس اسکیم کے اعزازی ڈائرکٹر ڈاکٹر اعجاز خاں ہیں جو ''ینگ سائنٹسٹ'' کا اعزاز حاصل کرچکے ہیں۔ اعظم ٹرسٹ کے چیئرمین منور پیر بھائی کی مناسب رہنمائی بھی طلبہ کو حاصل ہے۔ (ڈاک سے)

● کڈپہ۔ انجمن ترقی اردو، کڈپہ (آندھرا پردیش) کی طرف سے شکیل احمد شکیل کے ڈامیڈ سیٹ آڈیو کیسٹ کا اجرا اہدی ہائی اسکول، چاند پھرا گنبد، کڈپہ میں ہوا۔ تعارفی خطبہ جناب ستار فیضی نے پیش کیا اور جلسے کی نظامت معتمدِ عمومی سید

ہدایت اللہ نے کی۔ کیسٹ کا اجرا بدست ضلعی تعلیمی افسر، کڈپہ جناب والی بالیا نے کیا۔ سید شکیل احمد شکیل نے کیسٹ کے بارے میں بتایا کہ نصاب و امتحانی طریقے پر ہدایتوں کے ساتھ اس کیسٹ میں سماجی علوم انگریزی، اردو، سائنس، حساب، معلومات عامہ اور تدریسی رجحانات پر سوالات اور جوابات شامل کیے گئے ہیں۔ اس جلسے میں مولانا مصطفےٰ حسن بخاری، ڈاکٹر سید عبدالستار، ساحر رحمت اللہ، اے کے خان دلازک، محبوب باشاہ اور محمد بلال نے تقریریں کیں۔ (ڈاک سے)

● انجمن ترقی اردو کڈپہ شاخ کی جانب سے ڈامیڈ سیٹ کے اردو میڈیم طلبہ کے لیے کوچنگ کلاس کا اختتامی اجلاس ہدیٰ ہائی اسکول، رحمت اللہ اسٹریٹ کڈپہ میں 2 رجون کو منعقد ہوا۔ جلسے کی نظامت کنوینر اے کے خاں دلازک نے کی۔ استقبالیہ خطبہ عبدالستار فیضی نے پیش کیا۔ انجمن ترقی اردو، کڈپہ کا تعارف شریک معتمد سید شکیل احمد نے پیش کیا۔ جلسے کی صدارت مولانا مصطفےٰ معین بخاری صدر، انجمن ترقی اردو کڈپہ نے کی۔

اس جلسے کے مہمان خصوصی جناب پی محبوب خاں، مائناریٹی ویلفیئر آفیسر جناب راجا رتنم، جیلانی بادشاہ، محمد ہلال اور اعزازی مہمان جناب پی شاہد اللہ صدر ریاستی اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن، کڈپہ تھے۔ اس موقعے پر شاندار نتائج والے طلبہ میں انعامات تقسیم کیے گئے۔ اس اجلاس میں معتمد عموی سید ہدایت اللہ، شفاعت اللہ، محمد ایوب، جعفر حسین وغیرہ شریک ہوئے۔ محمد ایوب نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● کانپور، 7 رمئی۔ مسلم انٹر کالج میں منعقدہ ایک جلسے میں سماج سیوی ایکتا ایسوسی ایشن کی طرف سے مشہور عالم، شاعر اور ادیب سید قمر شاہجہانپوری کو ان کی علمی، ادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں شان کانپور ایوارڈ 2004 دیا گیا۔

(ڈاک سے)

● سیتاپور۔ ادبی تنظیم بزم اردو، سیتاپور کی شعری نشست بزم کے جنرل سکریٹری مست حفیظ رحمانی کی صدارت میں منعقد ہوئی جس کی نظامت رضوان خاں نے کی۔ نشست میں مست حفیظ رحمانی، اشتیاق علی صبا، رضوان خاں، منظر یٰسین، سلیم اختر، شکیل ملانوی، عارف سیتاپوری، عمران سیتاپوری اور خوشتر رحمانی نے کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

مشاعرہ

● نئی دہلی، 17 رجون۔ ثقافتی و ادبی تنظیم "حسن آرا ٹرسٹ" کی جانب سے انڈیا اسلامک کلچر سینٹر کے آڈیٹوریم میں "یاد سنیل دت" کے عنوان سے ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، جس کی سرپرستی ممتاز کانگریسی و ادبی محترمہ نرملا دیش پانڈے اور صدارت معروف فلم ساز و ہدایت کار مظفر علی نے کی۔ مہمان خصوصی لیفٹیننٹ گورنر دہلی بی ایل جوشی اور وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کی اہلیہ محترمہ گرشرن کور نے مشاعرے کی شمع روشن کی۔ لیفٹیننٹ گورنر نے سنیل دت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک ایسا پھول تھے جس کی خوشبو ہر ایک کو اپنی جانب کھینچتی تھی اور ان کے جانے کے بعد بھی یہ خوشبو باقی رہے گی۔ مہمان ذی وقار کے طور پر مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل ارجن سنگھ، محسنہ قدوائی، ایل ایم سنگھوی، ڈاکٹر فاروق اور سنیل دت کے قریبی ساتھی شکیل احمد نے شرکت کی۔

مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کی۔ مشاعرے میں پروفیسر وسیم بریلوی، انوپ سنگھ نادان، ولی بجنوری، ساغر خیامی، ڈاکٹر عظیم امروہوی، شکیل حسن شمسی، شیاما سنگھ صبا، سلیم امروہوی، ممتاز نسیم، پیمبر نقوی، اقبال اشہر، نرمل سنگھ رائے پوری، ونود اگنی ہوتری اور گوہر رضا نے اپنا کلام پیش کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رسم اجرا

کلیات بلراج مینرا

● نئی دہلی، 18 راپریل۔ جے این یو کے وائس چانسلر پروفیسر جی کے چڈھا نے "کلیات بلراج مینرا" (سرخ و سیاہ) مرتبہ سرور الہدیٰ کی رسم رونمائی انجام دی۔ اس جلسے کی صدارت اسکول آف لنگویجز کے ڈین پروفیسر امر بسو نے کی۔ پروفیسر جی کے چڈھا نے اپنی تقریر میں کہا کہ ایسے اہم اور تاریخی کاموں سے ہی کسی علمی ادارے اور یونیورسٹی کا وقار بڑھتا ہے۔ پروفیسر امر بسو نے انگریزی میں لکھے اپنے مضمون میں بلراج مینرا کی ترقی پسندی اور ان کے فنی رویے پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے مینرا کی شخصیت اور فن پر تفصیلی گفتگو کی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ مینرا کے یہاں تجربے کی سطح پر چاہے جو کچھ ہو مگر ان کے سماجی سروکار کے بغیر ان کی کہانیوں کی تفہیم ممکن نہیں ہے۔ پروفیسر صادق نے بلراج مینرا کی ادبی صحافت اور افسانہ نگاری پر گفتگو کی۔ ہندی کے مشہور نقاد پروفیسر مینیجر پانڈے نے بلراج مینرا کی کہانی "آتما رام" کا تجزیہ اور ڈاکٹر ویر بھارت تلوار نے مینرا کا سوانحی خاکہ پیش کیا۔ ڈاکٹر انور پاشا نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی کشمکش کے سیاق میں مینرا کے امتیازات کی نشان دہی کی۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں اساتذہ اور طلبہ موجود تھے۔ (ڈاک سے)

دبستان ٹٹیابرج کی ادبی خدمات

● ٹٹیابرج، 22 رمئی۔ شاہی امام باڑہ (ٹٹیابرج) ادبی سنگم اور اردو پروگریسو سوسائٹی کی طرف سے ڈاکٹر الف انصاری کی کتاب "دبستان ٹٹیابرج کی ادبی خدمات" کی تقریب رونمائی کی صدارت وزیر محنت مغربی بنگال جناب محمد امین نے کی۔ مہمان خصوصی حلیم ثمر آروی، ڈاکٹر محفوظ حسن رضوی، ڈاکٹر فہیم انور، جناب کوثر عظیم آبادی، جناب انجم عظیم آبادی، جناب مشتاق انجم، فراغ روہوی

(ایڈیٹر سہ ماہی "ترکش")، ڈاکٹر شبیر ابرہوی، الحاج مولانا قاسم علوی، جناب ایم کے اثر، جناب سید حسن اور ایڈووکیٹ بدرالدین بدر تھے۔ جناب سید علی محمد شہید نے جلسے کی نظامت کی۔ کتاب کا اجرا پرنس نیر قدر نے کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ ٹیا برج کی ڈیڑھ سو سالہ ادبی تاریخ کا احاطہ کرنے والی یہ کتاب دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ جلسے میں ایم کے اثر نے ایک مقالہ بعنوان "ڈاکٹر الف انصاری، تصانیف کے آئینے میں" پیش کیا۔ حلیم ثمر آروی، کمتر عظیم آبادی اور ڈاکٹر شبیر ابرہوی نے کتاب اور صاحب کتاب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ آخر میں صاحب کتاب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (ڈاک سے)

ریت کی دیوار

● نئی دہلی، 5 رجولائی۔ نوجوان شاعر سریندر سنگھ شجر کے مجموعۂ کلام "ریت کی دیوار" کے اجرا کے موقعے پر پنجاب کے سابق ڈائرکٹر جنرل پولیس کے پی ایس گل نے کہا کہ تقسیم ہند سے اردو زبان کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ انھوں نے خوشی ظاہر کی کہ شعروادب کے ذریعے اردو زبان آج ملک میں تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

کتاب کا اجرا انگولا میں ہندوستان کے سفیر م. افضل اور کے. پی. ایس گل نے مشترکہ طور پر کیا۔ دلی کینٹ ریزیڈنٹس ویلفیئر ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام انڈیا اِنٹیٹ سینٹر میں منعقدہ اس تقریب میں م. افضل نے اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ آج بھی اردو شعروادب کی تعمیر میں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی مل جل کر سرگرم عمل ہیں اور اردو ہی ملک کی ایک ایسی زبان ہے جسے قومی یک جہتی کی زبان کہا جاسکتا ہے۔

ممتاز شاعر مخمور سعیدی نے سریندر سنگھ شجر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ان کے یہاں سادگی اور پرکاری بطور خاص جلوہ گر ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ قدرت کا ان کے لیے ایک بڑا عطیہ ہے۔ شجر نہایت پراثر انداز میں سادہ الفاظ کی مدد سے اپنے مشاہدات و تجربات کو شعر کی شکل میں ڈھال دیتے ہیں۔ وہ بلاشبہ غزل کے بہترین شاعر ہیں اور ان کا مستقبل روشن ہے۔

اس موقعے پر دلی کینٹ علاقے کے ممبر اسمبلی کرن سنگھ تنور، ڈاکٹر اسلم پرویز، سردار اوتار سنگھ، بلراج کومل، دلی اردو اکادمی کے سابق سکریٹری منصور عثمانی، کنول جیت سنگھ سوڈھی، لیفٹننٹ کرنل پردیپ چند کے علاوہ اردو اور ہندی کے متعدد ادبا و شعرا موجود تھے۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

جانے والوں کی یاد

غلام جیلانی

● حیدرآباد، 6 رجولائی۔ اردو کے ممتاز ڈراما نگار اور افسانہ نگار جناب غلام جیلانی کا 6 رجولائی کو انتقال ہوگیا۔ وہ ایک ممتاز علمی و ادبی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد جناب غلام ربانی بابائے اردو مولوی عبدالحق کے قریبی رفیقوں میں سے تھے۔ ان کے ڈراموں اور افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ ان میں "دوسرا کنارہ"، "آٹھواں سفر"، "ڈھلتی دھوپ کی چھاؤں" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ غلام جیلانی نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور فلم کے لیے متعدد اسکرپٹ و منظرنامے لکھے ہیں۔ (سیاست، حیدرآباد)

مائل ملیح آبادی

● لکھنؤ، 19 رجون۔ معروف شاعر، ادیب اور سیاسی مفکر عبدالواحد خاں مائل ملیح آبادی کی 19 رجون کی صبح وفات ہوگئی۔ ان کی عمر 88 برس تھی۔ پسماندگان میں بیوی کے علاوہ تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ ان میں اردو اکادمی کے سابق صدر اور دیانت ڈگری کالج شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی بھی شامل ہیں۔ مرحوم کی کئی انقلابی نظمیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان کے ناولوں میں "نیا آدمی"، "کعبہ سے کربلا تک"، "مرگ یزید"، "سکھ"، "ادھوری بات" کے علاوہ ایک شعری مجموعہ "لازوال" اور سیرت پاک پر غیر مطبوعہ کلام "محمد اعظم صلی اللہ علیہ وسلم" قابل ذکر ہے۔ مرحوم نے 65 سال تک علم و ادب کی خدمت کی۔ وہ خاکسار تحریک الہند کے قائد رہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

شبیر احمد

● پٹنہ، 7 رجون۔ انجمن ترقی اردو بہار کے صدر پروفیسر عبدالمغنی، نائب صدر پروفیسر ایم. او. صدیقی، جنرل سکریٹری فخرالدین عارفی، خازن پروفیسر شکیب ایاز، سکریٹری ڈاکٹر نجیب اختر، ڈاکٹر محمد اسرائیل رضا اور ڈاکٹر سید احمد قادری نیز مجلس عاملہ کے رکن سید انیس الرحمٰن نے مشترکہ بیان جاری کرکے ڈاکٹر شبیر احمد، سابق سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ شبیر احمد کی وفات سے اردو تحریک کو زبردست نقصان ہوا ہے۔ موصوف نہ صرف ایک اچھے افسانہ نگار اور کامیاب صحافی تھے بلکہ اردو تحریک کے ایک اہم ستون تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو زبان کے فروغ کے لیے جدوجہد کی۔ انجمن ترقی اردو، بہار سے شبیر احمد ایک طویل عرصے سے وابستہ تھے اور انھوں نے اس ادارے کے تنظیمی سکریٹری کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ موصوف طویل عرصے تک درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے اور چند سال قبل سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں جن پر مختلف ریاستوں کی اکادمیوں کی جانب سے انعامات سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ (ڈاک سے)

تبصرہ وتعارف

کاشف الحقائق/سید امداد امام اثر

مرتب: ڈاکٹر وہاب اشرفی

صفحات: 740، قیمت: -/145 روپے -

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6 آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: مخمور سعیدی

سید امداد امام اثر اردو کے بلند مرتبت مصنفین میں ہیں۔ وہ بہ یک وقت کئی علوم وفنون میں درک رکھتے تھے اس لیے مختلف النوع تصانیف ان سے یادگار ہیں۔ ''کاشف الحقائق'' ان کی سب سے مشہور تصنیف ہے جس میں انھوں نے فنِ شاعری کی ماہیت اور اس کے عملی نمونوں پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ماہیتِ شاعری کے بیان کے علاوہ دیگر فنونِ لطیفہ بالخصوص موسیقی اور مصوری سے اس کے داخلی رشتوں اور باطنی مماثلتوں کی وضاحت بڑے دل نشیں پیرائے میں کی گئی ہے۔ اس حصے میں مصری، یونانی، رومی اور عربی شاعری کو خصوصیت سے موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے اور سنسکرت شاعری اور سنسکرت میں ڈراما نگاری کی مستحکم روایت بھی زیرِ بحث آئی ہے۔ مصنف شاعری کو زندگی کا آئینہ سمجھتے ہیں اس لیے شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ مذہب، اخلاق اور معاشرے کو بھی زیرِ بحث لاتے ہیں چنانچہ مصری، یونانی، رومی، عربی اور سنسکرت کی قدیم شاعری سے جب وہ ہمیں متعارف کراتے ہیں تو متعلقہ ملکوں کی اس وقت کی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی صورتِ حال کا تعارف بھی ساتھ ساتھ کراتے جاتے ہیں۔ اس حصے میں انھوں نے شاعری کی جو تعریف کی ہے وہ افلاطون کے تصورِ شاعری کی یاد دلاتی ہے جس کی وضاحت اس نے اپنی مشہور کتاب ''بوطیقا'' میں کی ہے۔ اسی باب میں امداد امام اثر نے شاعری کو دو قسموں خارجی اور داخلی میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے نزدیک خارجی شاعری:

''ایسے بیانات پر مشتمل ہوتی ہے جن سے عالم فی الخارج کے معاملات پیش نظر ہو جاتے ہیں.... بعض شعرا میں اس قسم کی شاعری کی صلاحیت ایسی دیکھی جاتی ہے کہ ان کے بیان سے معاملاتِ خارجیہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے اور جو لطف اعلیٰ درجے کے مصور کی قلمکاریوں سے اٹھتا ہے وہی لطف ان کے بیان سے پیدا ہوتا ہے...''

داخلی شاعری کے بارے میں ان کا خیال ہے:

''یہ شاعری انسان کے قوائے داخلیہ اور وارداتِ قلبیہ کی مصوری ہے''

''کاشف الحقائق'' کی جلد اول 1897 میں یعنی اب سے تقریباً ایک سو سال پہلے شائع ہوئی تھی، اس میں سید امداد امام اثر نے واضح طور پر شاعری کی جو دو قسمیں متعین کی ہیں اس سے ان کی ژرف نگاہی ظاہر ہوتی ہے اور آج بھی ہم ان سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں فارسی اور اردو شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے ان دونوں زبانوں کی شاعری کے ایک ساتھ تذکرے کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ ان زبانوں کی شاعری میں گہری مماثلت ہے اور دونوں زبانوں کے شاعروں کے ذہن وذوق میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ امداد امام اثر فارسی کے ساتھ جس میں دنیا کی بہترین شاعری موجود ہے، اردو کی قربت کو اردو کے حق میں مفید قرار دیتے ہیں کہ اس طرح شاعری کے کئی بنے بنائے سانچے اردو کو مل گئے۔ کئی اصنافِ سخن جو فارسی میں مروج تھیں اور جن میں خارجی اور داخلی دونوں طرح کی شاعری کی کامیاب مثالیں موجود تھیں، اردو شاعروں نے انھیں اختیار کر لیا اور ان میں خود بھی کامیاب شاعری کے نمونے پیش کیے۔ لیکن امداد امام اثر اس امر پر تاسف کا اظہار کرتے ہیں کہ اردو شاعروں نے سنسکرت شاعری کے خزانے سے کچھ استفادہ نہیں کیا جو ان کے اپنے گھر کی دولت تھی۔ یہ احساس اب عام ہوتا جا رہا ہے اور اس کمی کی تلافی کی کوشش بھی کی جا رہی ہے لیکن اثر کے زمانے تک اس طرف بہت کم توجہ کی گئی تھی۔

اس حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف کا تعارف اور ان اصناف کے معتبر نمائندوں کا نہ صرف ذکر ملتا ہے بلکہ ہر شاعر کی انفرادی خصوصیات واضح کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ بعض شعرا کا دوسری زبانوں کے شاعروں سے موازنہ بھی کیا گیا ہے مثلاً انیس کے مرثیوں کو وہ یونانی، لاطینی اور انگریزی شاعری کے بہترین نمونوں کے مقابلے میں رکھتے ہیں اور انیس کی شاعری کو ان سے برتر قرار دیتے ہیں۔ انیس کے ساتھ اس غلو آمیز عقیدت کا ایک سبب شاید اثر کی مذہبیت بھی ہے۔ اسی مذہبیت کے زیرِ اثر انھوں نے ایسے کئی موضوعات کو بھی کتاب میں شامل کر دیا ہے جو اس کے اصل مباحث سے قریب کا تو کیا دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے مثلاً اسلامی غزوات کا بیان اور اسی قسم کی بعض دوسری تفصیلات۔

امداد امام اثر کی زبان سو سوا سو برس پرانی زبان ہے اور اس میں عربی فارسی، بالخصوص عربی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ ان کے

زمانے میں مانوس و مروج رہے ہوں گے، لیکن آج کا قاری غالباً ان میں کچھ غرابت محسوس کرے۔ کتاب کا زیر نظر نسخہ مشہور ناقد ڈاکٹر وہاب اشرفی نے مرتب کیا ہے اور اس پر ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے جو کتاب کے تمام مباحث کا جزرسی کے ساتھ احاطہ کرتا ہے۔ کتاب قومی اردو کونسل کے معیار کے مطابق چھپی ہے۔

●

اڑیسہ میں اردو/ حفیظ اللہ نیولپوری

صفحات: 504، قیمت: -/157 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6 آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: فیاض عالم

''اڑیسہ میں اردو'' پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس میں مصنف نے اڑیسہ میں اردو زبان و ادب اور اس کے سیاسی، سماجی اور تاریخی و ثقافتی پس منظر، اردو نظم و نثر کے ابتدائی نقوش، اردو ڈرامے، اردو صحافت اور اردو تعلیم سے متعلق اہم ادبی و ثقافتی اداروں سے متعلق معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

حفیظ اللہ نیولپوری نے کتاب کے پہلے باب میں اڑیسہ کی مختصر تاریخ، تہذیب و تمدن اور اڑیسہ کے تعلیمی نظام کے علاوہ تقریباً ساڑھے چھ سو عربی و فارسی الفاظ کی نشاندہی کی ہے جو اڑیا زبان میں مروج و مستعمل ہیں۔ دوسرے باب میں اڑیسہ میں اردو شاعری کے آغاز و ارتقا سے بحث کی گئی ہے جس میں مصنف نے ہردے رام جودت کو اڑیسہ کا پہلا اردو شاعر قرار دیا ہے علاوہ ازیں مولوی محمد سلطان راجی، شیخ امین اللہ چرخی، عبدالمجید بھونیاں حیا، خاتم بہراج پوری، ظہورالحق ظہوری، مجرم سنبلپوری، فیض النسا بیگم تسخیر کٹکی، شمس الحق شمس، محمد یوسف یوسف، معلم سنبلپوری، عبدالرحیم احسن، سید عبدالستار عبد، اشرف علی کٹکی، اظہار علی کٹکی، جان محمد حازم، محمد محسن محسن، نورعلی انور، شیخ عبدالعزیز عاشق، مولا بخش خاں مولا، مولوی رحمت علی رحمت اور امجد نجمی کے احوال و کوائف اور دستیاب نمونہ کلام کے پیش نظر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

''اڑیسہ میں اردو نثر کا ارتقا'' کتاب کا تیسرا باب ہے جس کے پہلے حصے میں مولوی محمد سلطان راجی، محمد یوسف یوسف، شیخ غلام غوث، مولوی رحمت علی رحمت، مولوی عبدالرشید نقاد، امجد نجمی، پنڈت لکشمی نرائن مشرا اور شیخ حبیب اللہ کی نثر نگاری کو موضوع بنایا گیا ہے اور دوسرے حصے میں اڑیسہ میں اردو اسٹیج اور اردو ڈرامے پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب کے آخر میں اردو افسانے کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے باب کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے جن میں بالترتیب اڑیسہ میں اردو صحافت، اردو تنقید اور اردو تحقیق کی سمت و رفتار پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

کتاب کے آخری باب میں عصر حاضر میں اڑیسہ میں اردو کی صورت حال سے واقف کرایا گیا ہے۔ اس ضمن میں اڑیسہ کے اٹھائیس شعرا کے علاوہ ان پندرہ بیس شعرا کا بھی ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے اڑیسہ میں اردو شعر و ادب کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مقامی قلم کاروں میں مولوی سید برکت اللہ برکت، مولوی عبدالحلیم حلیم، عجیبہ خاتون عجب، حکیم عبدالرحیم راقم، سید عبدالحلیم نقیب، سید منظر حسن دسنوی، مولوی عبداللطیف عارف، حفظ اللہ حافظ، شمس الہدیٰ شمس، سید مصلحت ایزدی، تجمل علی تہمی، حیدر نایاب، رفیق درد، بہار الدین ریاض، کرامت علی کرامت، عبدالمجید فیضی، شکیل دسنوی، خالد رحیم، یوسف جمال، ساجد اثر، اسماعیل آذر، رشمی کانت راہی، اطہر عزیز، الطاف حسین حسرت، راشد شبنم، الطاف نادر، عبدالمتین جامی اور اولاد رسول قدسی کی شاعری کا اجمالاً تعارف کرایا گیا ہے اور ساتھ میں نمونۂ کلام بھی دیا گیا ہے۔ بیرونی قلم کاروں میں شمس مہدی، اصغر علی بیدل، عبدالجلیل خنجر، مظہر امام، فرحت زیدی، اوج اعظمی، سیلانی سیوتے، خان نیازی امروہوی، گھائل فریدآبادی، جبار غنی، معین الدین زخمی، شجاع ہمدانی، ڈی این شرما سوز کو شامل کیا گیا ہے، بعد ازاں اڑیسہ میں اردو تعلیم کی صورت حال، بعض اہم ادبی و ثقافتی اداروں اور اشاعتی سرگرمیوں سے واقف کرایا گیا ہے۔

مجموعی اعتبار سے ''اڑیسہ میں اردو'' اپنے موضوع کا پورا احاطہ کرتی ہے۔ اس اعتبار سے حفیظ اللہ نیولپوری کی یہ تحقیقی نوعیت کی کاوش متعلقہ ریاست میں اردو زبان و ادب کی تاریخ مرتب کرنے میں ایک اہم ماخذ ثابت ہوگی۔ اس کامیاب کوشش کے لیے مصنف و ناشر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

●

دھونی کتاب — پرواز/ ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام

ترجمہ اور آواز: گلزار

نقل حرفی: فرحانہ محمود

صفحات: 56، قیمت: -/175 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6 آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: رئیس احمد

''دھونی کتاب — پرواز'' صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کی خودنوشت سوانح "Wings of Fire" کا اردو ترجمہ و تلخیص ہے۔ کامیاب فلم ہدایت کار اور مشہور شاعر و ادیب گلزار نے اس خودنوشت سوانح کی تلخیص پر مبنی سی. ڈی. تیار کی ہے۔ انھوں نے اس تلخیص میں شامل واقعات کو اپنے مخصوص اور منفرد لب و لہجے میں بیان کیا ہے۔ خودکلامی کے انداز اور گلزار کے بیانیہ لہجے کی

بنا پر یہ کتابچہ ـــ "ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کی کہانی گلزار کی زبانی" کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ گلزار نے اس میں ہندوستانی زبان استعمال کی ہے جو اس دھونی کتاب (آڈیو ورژن) کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ آڈیو ورژن کی نقلِ حرفی (ٹرانسکرپشن) فرحانہ محمود نے کی ہے۔ اس طرح سی. ڈی. اور کتابچہ دونوں ایک ساتھ دستیاب ہیں۔ اس کا ایک افادی پہلو یہ ہے کہ جن قارئین کو آڈیو ورژن (سی. ڈی) سماعت کرنے کی سہولیات فراہم نہیں، وہ کتابچے سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ سی. ڈی سن کر سامعین پر دلنشیں موسیقی اور گلزار کے پُر اثر لب و لہجے کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے جب کہ کتابچے کے مطالعے سے ان لذتوں کو محض محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دونوں صورتیں سامعین و قارئین کو نہ صرف متاثر کرتی ہیں بلکہ اپنا ایک دیرپا نقش بھی چھوڑتی ہیں۔

"دھونی کتاب ـــ پرواز" سات حصوں میں منقسم ہے۔ اس کے مطالعے سے ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کے جامع تعارف کے ساتھ ساتھ ان کی ابتدائی زندگی کے اہم واقعات و حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ بلا شبہ مصنف کی سیرت و شخصیت اور ان کے کارہائے نمایاں نوجوان نسل کے لیے تاریک و سنسان راہوں میں مشعلِ راہ سے کم نہیں۔

حصۂ اوّل کے مطالعے سے مصنف کی زندگی کے ابتدائی احوال و کوائف کے علاوہ ان کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ گلزار نے اس کتابچے کے ہر حصے کے آغاز میں بطور پس منظر موضوع و مواد کی مناسبت سے مختلف ہندوستانی زبانوں مثلاً سنسکرت، تیلگو، پنجابی، مراٹھی اور اردو کے شلوک اور مصرعے پیش کیے ہیں، مزید برآں موسیقی کی فضا نے ایک خاص تاثر پیدا کر دیا ہے جس کے تناظر میں گنگا جمنی تہذیب و مزاج کا عکس بھی ابھرتا ہے۔

ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کی پیدائش شہر رامیشورم کے ایک متوسط خاندان میں ہوئی۔ والدین کی ذہنی اور روحانی تعلیم و تربیت کا ان کی زندگی پر گہرا اثر ہوا جس نے انھیں ناموافق اور پریشان کن حالات میں بھی ثابت قدم رہنا سکھایا۔ ان کے بہنوئی احمد جلال الدین اور چچازاد بھائی شمس الدین کی صحبت نے بھی انھیں زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہونا اور نشانِ منزل کی جانب مسلسل قدم بڑھاتے رہنا سکھایا۔ مذہبی رواداری بھی آپ کے خاندان کی ایک اہم خصوصیت تھی۔ رامیشورم مندر کے بڑے پروہت پکشی لکشمن شاستری ان کے والد زین العابدین کے گہرے دوست تھے اور دورانِ گفتگو دونوں حضرات مشکل سے مشکل روحانی مسائل پر بھی مقامی زبان میں اظہارِ خیال کیا کرتے تھے۔ بچپن میں والد صاحب کے ساتھ مسجد میں بلا ناغہ مغرب کی نماز ادا کرنے اور احمد جلال الدین کے ساتھ ہر شام سیر کو جاتے وقت مسجد گلی سے نکلتے ہوئے شو مندر پہنچ کر شردھا کے ساتھ "پری کرما" کرنے کا بیان قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کی ایک عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔

حصۂ دوم میں مصنف کے تعلیمی سفر کو جاری رکھنے کے لیے رامیشورم سے ضلع صدر دفتر 'رام ناتھ پورم' کے سفر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، جہاں پر شوارٹس ہائی اسکول میں ان کا داخلہ ہوا تھا اور یہیں پر پہلی بار بحیثیت استاد ایا دُرائی سولومن سے ان کی ملاقات ہوئی تھی، جن کی رہبری و رہنمائی ہمیشہ ان کے ساتھ رہی۔ مدراس ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ میں داخلے کی فیس کا انتظام نہ ہونے پر ان کی بہن زہرہ نے اپنے سونے کے کڑے اور چین فروخت کر کے یہ مسئلہ حل کیا۔ بہن کی اس قربانی نے انھیں پڑھائی کے معاملے میں بے حد سنجیدہ بنا دیا تھا اور انھوں نے اسی وقت یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اپنی محنت اور لگن سے وہ اعلیٰ مقام حاصل کریں گے اور اپنی بہن کے زیورات واپس لے آئیں گے۔ ایم. آئی. ٹی کی تعلیم کے دوران جن اساتذہ نے انھیں بہت زیادہ متاثر کیا تھا ان میں پروفیسر اسپونڈر، پروفیسر کے. اے. وی. پنڈلائی اور پروفیسر نرسنگھا راؤ قابلِ ذکر ہیں۔

تیسرے حصے میں ڈاکٹر کلام کے ایم. آئی. ٹی. کے بعد ہندوستان ایئرونوٹکس لمیٹڈ میں تربیت کے لیے داخل ہونے کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں انجینئرنگ گریجویٹ بننے کے بعد ایئر فورس اور وزارتِ دفاع میں انٹرویو دینے اور وزارت دفاع میں ڈھائی سو روپے ماہانہ کی تنخواہ پر سینئر سائنٹفک اسسٹنٹ مقرر کیے جانے کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ ملازمت کے دوران بنگلور سے کانپور منتقل ہونے کے بعد دونوں بڑے شہروں کا تہذیبی پس منظر مصنف کی زبانی ملاحظہ کریں۔ "میں نے کانپور میں، کلّے میں دبائے ہوئے پان والے، نواب واجد علی شاہ کے نقلچی بہت دیکھے ہیں اور بنگلور میں فرنگیوں کے انداز میں کتّے کی زنجیر تھامے ٹہلتے ہوئے صاحبوں کی کمی نہیں تھی"۔

'ناسا' میں تربیت کے لیے منتخب کیے جانے کے بعد ان کے والد انھیں رامیشورم کی اسی مسجد میں لے گئے اور شکرانے کی نماز ادا کی۔

چوتھے حصے میں 'ناسا' لینگلی ریسرچ سینٹر، ورجینیا میں کام کی شروعات کرنے کے بعد ان کے گوڈارڈ اسپیس فلائٹ سینٹر، گرین بیلٹ، میری لینڈ چلے جانے کا ذکر ہے۔ 'ناسا' سے لوٹنے کے بعد ہندوستان کا پہلا راکٹ 21 نومبر 1963 کو لانچ ہوا۔ یہ ساؤنڈنگ راکٹ تھا اور اس کا نام Nike Apache تھا، اس کی کامیابی کے بعد پروفیسر سارا بھائی نے ایک ہندوستانی راکٹ کا منصوبہ بنایا جسے پنڈت جواہر لال نہرو کی سرپرستی بھی حاصل ہوئی۔ پروفیسر سارا بھائی نے اس پروجیکٹ کے لیے نمائندہ سائنسدانوں کا انتخاب کیا اور ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کو اس پروجیکٹ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔

حصہ پنجم میں مصنف کی تحقیقی و تجرباتی مصروفیتوں کے علاوہ 1976 میں

102 سال کی عمر میں ان کے والد محترم کے انتقال کا ذکر ہے، اسی حصے میں ان کے بہنوئی اور والدہ محترمہ کی وفات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ 18 جولائی 1980 کی صبح ہندوستان کے پہلے سیٹی لائٹ لانچ وہیکل نے کامیاب اڑان بھری اور مصنف کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ — ''میں مشن ڈائریکٹر بول رہا ہوں...... چوتھی اسٹیج کامیابی کے ساتھ روہنی سیٹلائٹ کو لے کر انترکش میں داخل ہو رہی ہے''۔ 26 جنوری 1981 کو انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔

چھٹے حصے میں پرتھوی، ترشول، آکاش، ناگ، اور اگنی جیسے میزائلوں کے کامیاب تجربوں کا ذکر ہے۔ 'اگنی' کے کامیاب تجربے کے بعد مصنف نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ — ''اگنی ایک لو ہے، جو ہر ہندوستانی کے دل میں جل رہی ہے۔ اسے میزائل مت سمجھو، یہ قوم کے ماتھے پر چمکتا ہوا آگ کا سنہری تلک ہے''۔

آخری حصے میں مصنف نے 26 جنوری 1990 میں خود کو اور ڈاکٹر اروناچلم کو پدم وبھوشن سے نوازے جانے کا ذکر کیا ہے اور اس موقعے پر اپنے جملہ رفقائے کار اور اہل خانہ کو یاد کیا ہے۔ علاوہ ازیں اپنے خطاب میں ہم وطنوں سے کہا کہ — ''کاش ہر ہندوستانی کے دل میں جلتی ہوئی لو کو پر لگ جائیں اور اس لو کی پرواز سے سارا آسمان روشن ہو جائے''۔

''پرواز'' کا اس قدر دلچسپ آڈیو ورژن تیار کرنے کے لیے گلزار اور قومی اردو کونسل مبارکباد کے مستحق ہیں۔

•

لوک کہانیاں بھارت سے/اے. کے. راما نجن

مترجم: طاہرہ حسن

صفحات: 437، قیمت: -/120 روپے

ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ، گرین پارک، نئی دہلی

مبصر: اظہار احمد ندیم

ہندوستان میں لوک ادب کی وسیع روایت موجود رہی ہے۔ یہ ادب خواہ کہانیوں کی شکل میں ہو یا گیتوں کی شکل میں، اپنی مٹی، اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت سے گہرے طور پر وابستہ ہے۔ لوک ادب میں ہندوستانی گاؤں اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ منظر عام پر آتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ''لوک کہانیاں بھارت سے''، میں ہمارے ملک کی مختلف ریاستوں کی لوک کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ ہم جیسے جیسے ان کا مطالعہ کرتے جاتے ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ حقائق ہمارے سامنے آتے چلے جاتے ہیں اور مختلف ریاستوں کی تہذیب میں جو فرق ہے وہ اجاگر ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً کنڑ میں محاورہ ''چراغ تلے اندھیرا'' سے یہ مراد لیا جاتا ہے کہ ایک پاکباز آدمی میں بھی برائیاں ہو سکتی ہیں جبکہ اس کے برعکس کشمیری میں یہ محاورہ ''ایک نیک دل راجا کے بہت برے مصاحب ہو سکتے ہیں'' کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی دوسری مثال یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں کہانی کے خاتمے پر نانی یا دادی اماں بچوں سے یہ سوال پوچھتی ہیں کہ بتاؤ بچو اس کہانی سے تم نے کیا سبق حاصل کیا، مگر ہمارے ہی ملک کی دوسری زبانوں میں کہانیوں کے خاتمے کے لیے کچھ الگ قسم کے جملے مخصوص ہیں جیسے آسامی میں کہانیوں کا خاتمہ یوں ہوتا ہے کہ ''ہمیں اپنے کپڑے دھوبی کے یہاں بھیجنے تھے، چنانچہ ہم گھر چلے آئے''، تیلگو میں یہ کہتے ہیں کہ ''کہانی کانچی چلی گئی اور ہم آگئے، ہم یہاں ہیں''۔ کنڑ میں یہ کہتے ہیں کہ ''وہ لوگ وہاں ہیں اور ہم یہاں ہیں''۔ بھوجپوری میں کہتے ہیں ''قصہ گیا بن میں، سوچو اپنے من میں''۔

اردو میں لوک کہانیوں کی اشاعت پر کم توجہ دی گئی ہے۔ حالیہ دنوں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس جانب توجہ مرکوز کی ہے اور لوک کہانیوں کے کئی انتخابات شائع کیے ہیں جن میں ''بھارت کی لوک کتھائیں'' (تین جلدوں میں) ''ہندوستان کی لوک کہانیوں کا خزانہ'' (دو جلدوں میں)، ''ہماری لوک کہانیاں''، ''نورتن کہانیاں''، ''مصر اور شمالی افریقہ کی کہانیاں''، ''مالوے کی کہانیاں'' اور ''دیس دیس کی کہانیاں'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ بہار اردو اکادمی نے ''دنیا کی لوک کہانیاں'' (مرتب: احمد جمال پاشا) شائع کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے مرتب جی۔ ڈی۔ ٹنڈن شکاگو یونیورسٹی میں درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں۔ اس کتاب کے لیے انھوں نے ہندوستان کی بائیس زبانوں سے کہانیاں منتخب کی ہیں۔ اسلوب اور زبان میں جی ڈی ٹنڈن نے جہاں ضرورت محسوس کی ہے وہاں تبدیلی کی ہے تاکہ کہانی کی روانی اور دلچسپی متاثر نہ ہو۔ کہانیوں کا الگ الگ خانہ قائم کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک خانے میں اس طرح کی کہانیاں ہیں جن میں مرد مرکزی کردار ہیں دوسرے میں وہ کہانیاں ہیں جن میں عورتیں مرکزی کردار ہیں۔ آخر میں مزاحیہ کہانیاں ہیں۔ کتاب دلچسپ ہے اور قارئین پر ایک تاثر قائم کرتی ہے۔

طاہرہ حسن نے اس کتاب کا ہندی سے بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ کہانیوں کو پڑھتے، وقت ترجمے کی بجائے اصل کا گمان گزرتا ہے۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ امید ہے کہ اردو قارئین اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

•

دکنی کلام اور اسلامی تہذیبی تاریخ

مرتب: خواجہ معین الدین عزمی

صفحات: 491، قیمت: -/300 روپے

ملنے کا پتہ: سیل کاؤنٹر دفتر روزنامہ سیاست، حیدرآباد

مبصر: عطاء الرحمٰن قاسمی

ابو النصر محمد خالدی کی اس کتاب میں سرزمین دکن کے قدیم شاعروں اور ادیبوں کی مثنویوں میں مستعمل الفاظ و محاورات، استعارات، کنایات اور تلمیحات کی تحقیق و تشریح کے ساتھ دکن میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی ابتدا و ارتقا کا

بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ حصۂ اول میں کتاب کے مرتب خواجہ معین الدین عزمی نے ابوالنصر محمد خالدی کے احوال و کوائف اور علمی فتوحات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ دکن کی مثنویوں کی تاریخ اور اسلامی تہذیبی تاریخ کا پس منظر بیان کرنے کے بعد دکنی مثنوی گو شعرا میں محمد حسینی، مجی، فاروقی، امین گجراتی، کمین، سیلان، طالب، اسماعیل حاجی محمد رفعتی فتاحی، اور حسینی معظم قادری بیجاپوری وغیرہ معماران زبان و ادب پر گفتگو کی ہے جنھوں نے اردو زبان کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ابوالنصر محمد خالدی نے بڑی محنت و کاوش سے دکنی مثنوی نگاروں کے اشعار یکجا کیے ہیں جو تحقیقی نقطۂ نگاہ سے بڑا اہم کام ہے۔

ابوالنصر محمد خالدی نے دکنی الفاظ و محاورات کی اصلیت اور ان کے تلفظ اور املا کی صورت حال پر لغوی اور اصطلاحی بحث کی ہے اور ان کی صوتی و ہیئتی تبدیلیوں و تغیرات کا منصفانہ جائزہ لیا ہے اور قدیم دکنی زبان میں یہ الفاظ اور محاورات کس طرح استعمال ہوتے تھے اور اب کس طرح بولے جاتے ہیں، ان کا موازنہ بھی کیا ہے۔ بطور مثال چند الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

☆ وضا : وضع	☆ فام : فہم
☆ منگیاں : مانگا	☆ سمد : سمندر
☆ شرمندی : شرمندہ	☆ تمام : تھم
☆ سات : ساتھ	☆ استن : ستون
☆ بی : بھی	☆ کچو : کچھ

کتاب کے آخر میں مثنوی کے اوزان و قوافی پر گفتگو کی گئی ہے جو فن شاعری کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بہ اعتبار مجموعی یہ کتاب دکنی زبان و ادب اور اسلامی تہذیبی تاریخ کے موضوع پر ایک معلومات افزا کتاب ہے۔ جس میں دکنی تہذیب و تمدن کے جلوے بکھرے نظر آتے ہیں۔ □□□

عربی ادب کی تاریخ (جلد اول)

مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

اس کتاب کے مقدمے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے صاحب کتاب کی صلاحیتوں کی داد ان لفظوں میں دی ہے— ''ان کے ذہن و ذوق نے اس موضوع کو صحیح طور پر ہضم کر لیا ہے اور وہ اس میں محض نقال یا خوشہ چیں نہیں ہیں بلکہ اس سے لطف لینے میں اہل زبان کے شریک اور اہل ذوق کے ہمنفس اور ہمنوا ہیں۔ ان کی تحریر میں سنجیدگی بھی ہے، شگفتگی بھی، سلاست بھی حلاوت بھی، مورخ کا احساس ذمہ داری بھی اور ایک صاحب ذوق کا انبساط و احتظاظ بھی۔''

صفحات: 352، قیمت: -/86 روپے

قدیم جنوبی ہند میں عربی، فارسی ادبیات کی چھ سو سالہ تاریخ (جلد اول۔ ثانی)

مصنف: کاوش بدری

جنوبی ہند میں اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کو بھی خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا۔ اس کتاب میں تمل ناڈو میں عربی زبان و ادب کے فروغ کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز وہاں کے اہم علما کا تعارف، کتب خانوں اور نادر مخطوطات کی تفصیلات، اہم عربی مدارس اور عصر حاضر میں عربی تعلیم پر بھی گہری نظر ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 176، قیمت: -/98 روپے

دل کی گیتا

مدون: مخمور سعیدی

''شریمد بھگوت گیتا'' ہندستان کا وہ الہامی صحیفہ ہے جس کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کے تراجم ہوتے رہے ہیں لیکن خواجہ دل محمد کا یہ ترجمہ گیتا کا بہترین ترجمہ ہے جو اردو نظم میں کیا گیا ہے— ترجمے میں بہت سے مقامات پر کثیر المعانی الفاظ آئے ہیں، خواجہ صاحب نے ایسے تمام مقامات پر حاشیے میں وہ معنی درج کر دیے ہیں جو وہاں مطلوب ہیں۔ جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے حواشی میں مطالب کی تفسیر و توضیح بھی کرتے گئے ہیں۔

صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے

یونانی ادویۂ مفردہ

مصنف: حکیم سید صفی الدین علی

طب یونانی میں دو طرح کی ادویہ استعمال کی جاتی ہیں، مفرد اور مرکب۔ اگر طبیب مرض کی علامات کی بہتر تشخیص کر لے تو مفرد ادویہ کے ذریعے بڑی آسانی سے علاج کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیموں نے مرکبات کی بجائے مفردات کے استعمال پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ اس کتاب میں 334 ادویہ کی تفصیل درج کی گئی ہے جس میں مختلف فواکہات اور میوہ جات سے لے کر انواع و اقسام کی جڑی بوٹیاں اور پودے بھی شامل ہیں۔

صفحات: 365، قیمت -/70 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

مصنف: دلیپ. ایم. سالوی　　"ہندوستان کے سائنسداں" سے اقتباس　　بچوں کا گوشہ

مترجم: اقبال مہدی زیدی، غلام حیدر

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ذیل میں کونسل کی شائع کردہ کتاب "ہندوستان کے سائنس داں" سے ایک اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔

اس کتاب میں ہمارے ملک کے تمام اہم سائنس دانوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ان میں چرک، آریہ بھٹ، برہم گپت، سی وی رمن، ایم این ساہا، جگدیش چندربوس، ہومی جہانگیر بھابھا، وکرم سارا بھائی، ایم ایس سوامی ناتھن اور شانتی سروپ بھٹناگر کے علاوہ درجنوں سائنسدانوں کے احوال و کوائف سے واقف کرایا گیا ہے۔ 170 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 30روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

سالم علی

دھائیں! ایک چڑیا دو چار سیکنڈ پھڑ پھڑائی اور زمین پر گر پڑی۔ دس سال کا ایک لڑکا، چشمہ لگائے، دوڑا اور اسے جھپٹ کر اٹھا لیا۔ یوں تو چڑیا گھروں والی عام چڑیا (گوریا) لگتی تھی مگر لڑکا حیران تھا کہ اس کی گردن پر یہ پیلا دھبہ کیسے ہے؟ اس معمے کو حل کرنے کے لیے وہ دوڑا ہوا اپنے چچا امیرالدین طیب جی کے پاس پہنچا جو بہت مانے ہوئے شکاری تھے، اور ان سے پوچھا کہ یہ کون سی چڑیا ہے۔ بہرطور، چچا بھی اسے نہ پہچان سکے اور وہ لڑکے کو ممبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی لے گئے، جو اس وقت اپولو اسٹریٹ کی ایک بہت بڑی بلڈنگ کے ایک بہت چھوٹے سے کمرے میں ہوا کرتا تھا۔ لڑکے کا تعارف سوسائٹی کے اعزازی سکریٹری ڈبلیو ملرڈ سے کرایا گیا۔

ملرڈ کو ایک ہندوستانی لڑکے کو کسی چڑیا میں اتنی دلچسپی لیتے دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ لڑکے کو کمرے میں رکھے گئے ان چڑیوں کے جسموں کو دکھانے لے گئے جن میں بھراؤ کر کے وہاں سجایا گیا تھا (انھیں اسٹفڈ جسم کہتے ہیں)۔ پھر ایک کے بعد ایک درازیں کھول کر وہاں رکھی ہوئی چڑیاں لڑکے کو دکھائی گئیں۔ اس نے تو خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اتنی طرح کی چڑیاں ہوتی ہیں۔

اور پھر یہ دیکھ کر تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ اتنی مختلف قسم کی گوریاں ہوتی ہیں جتنی ملرڈ نے ایک دراز میں رکھی اسے دکھائیں۔ بہت احتیاط سے ان میں سے چھانٹ کر ایک چڑیا ملرڈ نے اٹھائی اور لڑکے کو دکھائی۔ یقیناً یہ بالکل ویسی ہی چڑیا تھی جیسی وہ لایا تھا۔ پیلے گلے والی گوریا۔

"انکل ملرڈ" ! لڑکے نے حیرت سے کہا، "مجھے پتہ نہیں تھا اتنی بہت سی الگ الگ طرح کی چڑیاں ہوتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے بارے میں سب کچھ میں بھی جان جاؤں۔"

طرح مسکرائے انھوں نے تو بڑے لوگوں میں بھی چڑیوں میں اتنی دلچسپی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے بعد یہ لڑکا متواتر اس دفتر میں آنے لگا۔ اس نے چڑیوں کو پہچاننے اور مردہ چڑیوں کو بھرنا (اسٹف کرنا) سیکھ لیا۔

یہ لڑکا معزالدین عبدالعلی تھا جو بعد میں سالم علی کے نام سے مشہور ہوا۔ بعد میں تو سالم علی ''چڑیوں کے غیر معمولی مشاہدہ کرنے والے'' (برڈ واچر ایکسٹرا اور ڈینری) کہے جاتے تھے۔ یہ 12 نومبر 1896 کو پیدا ہوئے اور آخری دم تک چڑیوں میں ان کی دلچسپی برقرار رہی۔ انھیں'' جے. پال گیٹی وائلڈ لائف کنزرویشن پرائز ملا جو چڑیوں کے مطالعے (طیریات یا ورنیتھولوجی (Oranthology) میں بہت اہم کام کرنے پر دیا جاتا ہے۔ پھر انھیں بہت سے قومی اعزازات اور انعامات بھی ملے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سالم علی کے پاس کسی یونیورسٹی کی کوئی ڈگری نہیں تھی۔ ویسے انھوں نے کالج میں داخلہ لیا بھی مگر الجبرا اور لوگرتھم (Logerithm) انھیں بالکل نہ بھائے اور انھوں نے کالج چھوڑ دیا۔ وہ اپنے بھائی کی کانوں کی کھدائی کے کاروبار میں مدد کرنے برما چلے گئے، مگر یہاں بھی کام نہ چلا۔ جنگلوں میں ایک قسم کی دھات (وولفرام) کی بجائے یہ چڑیاں ڈھونڈتے پھرتے تھے۔

ممبئی واپس آکر انھوں نے زولوجی (علم حیوانیات) میں ایک کورس کیا اور ممبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ جانوروں کی کھال اتارنے اور چڑیوں کو بھرنے کے سلسلے میں اعلیٰ تربیت حاصل کرنے کے لیے جرمنی گئے مگر جب واپس لوٹے تو وہ پھر بے روزگار تھے۔ پیسوں کی کمی کی وجہ سے میوزیم میں ان کی جگہ ہی ختم کر دی گئی تھی۔

اب وہ شادی شدہ آدمی تھے اس لیے انھیں نوکری فوراً چاہیے تھی۔ لیکن کوئی نوکری جس کی وہ ان حالات میں توقع بھی کر سکتے تھے وہ زیادہ سے زیادہ کلرکی ہوتی جس کے ساتھ انھیں چڑیوں کے مطالعے کے لیے بہت کم وقت مل پاتا۔ شکر ہے کہ ان کی بیوی کے پاس آمدنی کا کچھ ذریعہ تھا، چنانچہ انھوں نے ہی انھیں سہارا دیا۔ یہ دونوں بندرگاہ کے پار کیہم میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے لگے۔

یہ پیڑ پودوں کے بیچ میں خاموش اور پرسکون جگہ تھی۔ جب برسات آئی تو یہ دیکھ کر سالم علی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہاں ان کے گھر کے پاس بیا (ویور برڈ) چڑیوں نے اپنی پوری بستی بسالی ہے۔ اس چڑیا کے بارے میں اس وقت تک بہت کم جانکاری تھی اور یہ قدرت نے انھیں ایک سنہری موقع دے دیا تھا۔ تین چار مہینے تک گھنٹوں، صبح سے شام تک سالم علی نے اس چڑیا کے رہن سہن اور عادتوں کا گہرا مطالعہ کیا اور پھر 1930 میں جب ان کی یہ جانکاری چھپی تو ساری دنیا انھیں جان گئی اور ان کی صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا۔

اتنا طویل عرصہ جو انھوں نے بیا چڑیا کے مطالعے میں گزارا تھا اس نے انھیں یہ احساس دلایا کہ خود مشاہدہ اور تجربہ کرکے بنیادی معلومات حاصل کرنا ہی اہمیت رکھتا ہے، ادھر ادھر سے سنی سنائی باتوں پر، چاہے وہ کتنی ہی شہرت پا چکی ہوں، یقین کر لینا غلط ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مشاہدوں کی بار بار تصدیق کی اور جلدی یا بے صبری سے کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ اس سے انھیں چڑیوں کے مشاہدہ کرنے والوں میں بڑا مستند مانا جانے لگا۔ حالانکہ کبھی کبھی دنیا کے جانے مانے ماہرین سے ان کا اختلاف بھی ہوا۔ اس کی سب سے مشہور مثال ''ریکٹ ٹیلڈ ڈرونگو'' کی دم پر پر اُگنے کے سلسلے میں ان کے مشاہدے کی تھی۔ ایک بہت جانے مانے پرندوں کے ماہر کا کہنا تھا کہ سالم علی اس

سلسلے میں غلطی پر ہیں، مگر آخر میں سالم علی کی ہی تصدیق ہوئی اور ان کی بات مانی گئی۔ ''افن کے بیئے'' کی دریافت بھی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔اس کے بارے میں خیال تھا کہ یہ لگ بھگ 100 سال پہلے ناپید ہو چکا ہے، مگر انھوں نے کماؤں کی پہاڑیوں میں ڈھونڈ نکالا۔

بچپن سے ہی سالم علی ہندوستانی پرندوں پر ایک اچھی کتاب چاہتے تھے۔ جو کتابیں اس وقت تھیں بھی ان میں بغیر تصویروں کے لمبے لمبے خشک بیان ہوتے تھے جن سے نوعمر یا نیا شوق رکھنے والوں کی اس موضوع سے دلچسپی بڑھنے کے بجائے کم ہی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ 1941 میں انھوں نے اس کمی کو پورا کرنا چاہا۔ انھوں نے جو کتاب ''دی بک آف انڈین برڈس'' کے عنوان سے لکھی اس میں ہر نوع (قسم۔ اسپیشی spicies) کی رنگین تصویروں کے ساتھ دلچسپ انداز بیان اختیار کیا گیا تھا۔ ایک عام آدمی بھی اس کی مدد سے آسانی سے کسی چڑیا کو پہچان سکتا تھا۔ 1948 میں انھوں نے بین الاقوامی شہرت کے مالک ایس۔ڈلون رپلے کے ساتھ مل کر ایک دس جلد کی کتاب ''ہینڈ بک آف دی برڈس آف انڈیا اینڈ پاکستان'' تیار کرنے کا بڑا منصوبہ بنایا۔ اس کتاب میں برصغیر کی ساری چڑیوں کے متعلق ہر طرح کی معلومات موجود ہیں۔ جیسے ان کی ظاہری شکل وصورت، عام طور پر کہاں پائی جاتی ہیں، ان کی پیدائش و افزائش کے سلسلے کی عادتیں اور ان کے بارے میں ابھی کیا معلومات حاصل کرنا باقی ہیں۔

سالم علی نے چڑیوں کے مشاہدے اور سروے کے سلسلے میں پورے ملک کے کونے کونے کا سفر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ملک میں مشکل سے ہی کوئی ایسی جگہ ہوگی جہاں ان کے ربر کے جوتے کے موٹے سول نے نشان نہ چھوڑا ہو۔ سالم علی کا انتقال 1987 میں ہوا۔

بیا۔(Weaver Bird)

سالم علی کے مشاہدے کے مطابق بیئے کی ''کالونی'' (ایک ساتھ بہت سے گھونسلے) کے بنیادی دستکار اور معمار (آرکیٹیکٹ) نر بیئے ہوتے ہیں۔ یہی مناسب جگہ چنتے ہیں اور پھر دبیز پتوں اور موٹی گھاس کو استعمال کر کے یہ اپنا بوتل کی شکل کا گھونسلا بننا شروع کرتے ہیں۔ جب گھونسلا لگ بھگ تیار ہو جاتا ہے تو مادہ بیا آتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک، انھیں اچھی طرح دیکھ بھال کر، اپنے لیے ایک گھونسلا چن لیتی ہے۔

اب مادہ بیا اپنے گھونسلے کی آخری نوک پلک درست کرنے میں مدد دیتی ہے اور پھر انڈے دیتی ہے۔ جس عرصے میں وہ انڈے دے رہی ہوتی ہے تو نر بیا ایک اور گھونسلا بُننا شروع کر دیتا ہے۔ جب یہ مکمل ہونے لگتا ہے تو ایک اور مادہ آتی ہے اور یہ دونوں اس وقت تک ساتھ رہتے ہیں جب تک دوسری مادہ انڈے سینے کا کام نہ شروع کر دے۔ اب پھر نر اسے چھوڑ کر نیا گھونسلا بننا شروع کر سکتا ہے۔

اس طرح نر بیئے کے دو یا تین خاندان ایک وقت میں پلتے ہیں۔ پھر بھی یہ اتنا سمجھ دار ہوتا ہے کہ اس کے بعد یہ گھونسلے بننا بند کر دیتا ہے۔ چوزوں اور خاندان کو کھلانے پلانے کا کام مادہ بیوں کے سپرد ہوتا ہے۔

□□□

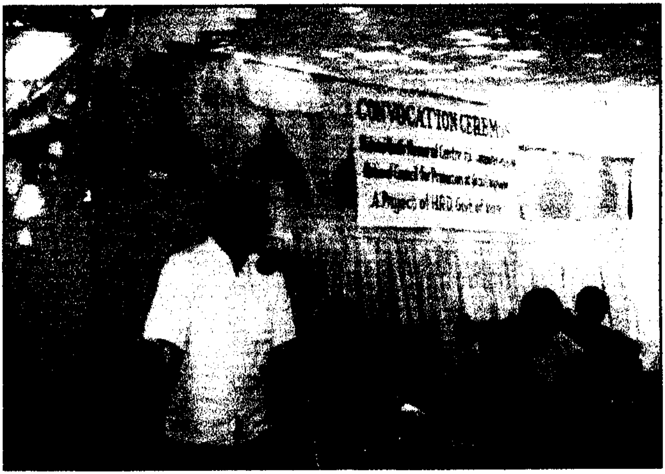

قومی اردو کونسل کی طرف سے الہ آباد میں چلائے جارہے قدوائی قادر میموریل سینٹر فور کمپیوٹر ایجوکیشن کا جلسہ تقسیم اسناد 28 رمئی 2005 کو منعقد ہوا جس میں جناب شمس الرحمن فاروقی وائس چیئرمین قومی اردو کونسل بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ تصویر میں طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے جناب شمس الرحمن فاروقی، ساتھ میں سینٹر انچارج محترمہ جمیلہ فاروقی کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

قومی اردو کونسل کی طرف سے چلائے جانے والے سجاد انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی اور سجاد کمپیوٹر ٹریننگ اینڈ گائیڈنس سینٹر مدراس کا جلسہ تقسیم اسناد 22 رمئی 2005 کو منعقد ہوا۔
اس موقعے پر لی گئی ایک یادگار تصویر۔

URDU DUNIYA Monthly, August 2005, Vol. 7, Issue:8 Date of Publication: 24/07/2005
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi.

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

مرتبہ: سیدہ جعفر

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا معمار محمد قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا قدر شناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیدہ جعفر صاحبہ نے محققانہ انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈہ کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات: 823، قیمت -/175 روپے

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی شاعری صوفیانہ کیفیات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

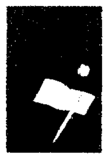

مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو

حکیم آغا جان عیش دہلوی ذوق، مومن اور غالب کے ہم عصروں میں تھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ غالب کی مشکل پسندی پر ان کا طنزیہ قطعہ "اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے" مشہور ہے مگر غالب کی وفات پر انھوں نے جو تاریخی قطعہ بند اشعار کہے ہیں وہ غالب سے ان کی محبت و مودت کو ظاہر کرتے ہیں۔ عیش خوش فکر شاعر تھے اور انھوں نے اپنا مرتب دیوان اپنی زندگی ہی میں مرتب کرلیا تھا۔ ڈاکٹر حبیبہ بانو کے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ دیگر اصناف سخن بھی ہیں جو عیش سے یادگار ہیں۔ مفصل مقدمے کے ساتھ۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 556، قیمت: -/80 روپے

مصنف: نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بزبان فارسی قلمبند کیا تھا اور اس کے بعض بیانات اس دور کے شعرا کا ذکر آئے تو آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہو گیا ہے۔ اس اہم تذکرے کو جو حصہ میں سے شیفتہ کے زمانے تک کے بیسیوں شعرا اور شاعرات کے مختصر کوائف اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے۔ محترمہ حمیدہ خاتون نے اصل کتاب کے متعدد نسخوں کو سامنے رکھ کر اسے اردو میں منتقل کیا ہے اور شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 430، قیمت -/128 روپے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن میر انیس کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام مستند مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جو اب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اوّل، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 540، قیمت: -/36 روپے

جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 575، قیمت: -/40 روپے

مرتب: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

حسرت، اصغر، جگر اور فانی کو ان کی زندگی ہی میں غزل کے چار ستونوں کی حیثیت دے دی گئی تھی لیکن ان میں سے ہر شاعر کا انداز فن جداگانہ ہے۔ فانی کی خصوصیت ان کی حزن پسندی ہے جس نے ان کے کلام میں ایک خاص اثر پیدا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے مرتبہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ فانی کی کہی ہوئی نظمیں، قصیدے، قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ شروع میں مرتب نے فانی کی شخصیت اور شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 318، قیمت: -/63 روپے

مصنف: سید امداد امام اثر

سید امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں [illegible] کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں [illegible] دوسرے حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف [illegible] اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 740، قیمت -/145 روپے

مصنف: ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری

[illegible] کی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں [illegible] دوسرا باب [illegible] بیان میں ہے۔ چھٹا باب [illegible] فصلوں میں منقسم ہے [illegible]

پہلا ایڈیشن: صفحات: 504، قیمت: -/157 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا

Printed and Published by Director NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at S Narayan & Sons B-88 Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL West Block-1 Wing-6 R.K. Puram New Delhi-110 066, Editor Dr M Hamidullah Bhat Tel 26103381 26103938.